اندھیروں سے روشنی کی طرف

مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

پاکستان میں اقامت دین کے لئے
کھڑے ہونے والی جماعتوں کے منہج و فکر کا تجزیہ

شیخ حمید اللہ برہان

اسلامی لائبریری

پاکستان میں اقامت دین کے لئے کھڑے ہونے والی جماعتوں کے منہج و فکر کا تجزیہ

﴿مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

اندھیروں سے روشنی کی طرف

تالیف:

شیخ حمید اللہ برہان

انٹرنیٹ ایڈیشن:

مسلم ورلڈ ڈیٹا پروسیسنگ پاکستان

http://www.muwahideen.co.nr

کتاب کا نام: ﴿مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾
اندھیروں سے روشنی کی طرف

ترتیب وتدوین: شیخ حمید اللہ برہان

طبع اوّل: شوال 1433ھ بمطابق ستمبر 2012ء

تعداد: 2500

ناشر: ادارۂ فروغ اسلام، لاہور

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾(البقرۃ:257)

”اللہ ان لوگوں کا حامی ومدگار ہے جولوگ ایمان لاتے ہیں ،وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالتا ہے اور جولوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ،ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں ،وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔یہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے“۔

فہرست

تنظیم اسلامی کے فکر و منہج کا تجزیہ

جمعیت علمائے اسلام کے منہج و فکر کا تجزیہ

اصل مسئلہ کیا ہے؟

پہلا مسئلہ: کفر و ارتداد

دوسرا مسئلہ: دارالاسلام اور دارالحرب

تیسرا مسئلہ: یہود ونصاریٰ کی مدد ونصرت

چوتھا مسئلہ: الحکم بغیر ما انزل اللہ

مقدمہ

اقامت دین، شریعت کا نفاذ یا اس حوالے سے سب سے جامع ترین اصطلاح ''خلافت کا قیام'' وہ اہم ترین فریضہ ہے جو کہ ہر کلمۂ توحید پڑھنے والے پر واجب ہے اور یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لئے انبیاء ورسل کو مبعوث کیا جاتا رہا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾(الحدید:25)

''ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں اور ترازو (یعنی نظامِ عدل وقسط) نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں''۔

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾(الشوری:13)

''اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا، اور جسے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دے چکے ہیں ،اس تاکید کے ساتھ کے دین کو قائم کرو اور اس بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ''۔

یہ ہی وجہ ہے کہ خلافت کا قیام رکن دین میں سے ہے۔ چنانچہ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''انھا رکن من ارکان الدین الذی به قوام المسلمین ''۔(الجامع لاحکام القرآن،ج:1،ص:252)

''اور وہ (خلافت) ارکان دین میں سے ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کے اجتماعی نظام کا قیام ہوتا ہے''۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ خلافت کے قیام کو دینی فرائض میں سے سب سے بڑا فریضہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یجب ان یعرف ان ولایۃ امر الناس من اعظم واجبات الدین بل لاقیام للدین ولا الدنیا الابھا''۔(السیاسۃ الشرعیۃ،ص:161)

''یہ جان لینا واجب ہے کہ لوگوں کے (اجتماعی) معاملات کے لئے ولایت (خلافت) دین اسلام کے فرائض میں سے ایک بڑا فریضہ ہے بلکہ دین و دنیا کا قیام اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے''۔

امام نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''والمسلمون لابد لھم من امام یقوم بتنفیذ احکامھم واقامۃ حدودھم وسد ثغورھم وتجھیز جیوشھم واخذ صدقاتھم وقھر المتغلبۃ والمتلصصۃ وقطاع الطریق واقامۃ الجمعۃ والاعیاد''۔(شرح العقائد النسفیۃ103۔شامی ،ج:2،ص:280)

''مسلمانوں کے لئے ایسے امام کا ہونا ناگزیر ہے جو احکامات (شرعیہ) کو نافذ کرے، حدود (اللہ) کو قائم کرے، سرحدوں کی حفاظت کرے، صدقات وصول کرے، سرکشوں ،چوروں اور ڈاکوؤں پر قابو پائے اور جمعہ و عیدین کو قائم کرے''۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر دورِ نبوت الصلوٰۃ والسلام تک اور اس کے بعد دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک اہل ایمان یہ فریضہ انجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ خلافت کے قیام کے حوالے سے اہل ایمان کی کوششوں کے دو ہی محور تھے:

(ا)......خلافت کے انعقاد اور اس کے قیام کے لئے کوشش کرنا۔

(۲)........اور خلافت کے قائم ہو جانے کے بعد اس کی حفاظت اور اس کی توسیع کے لئے کوشش کرنا۔

اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حجۃ الوداع تک تمام تر کوشش کا حاصل یہ رہا کہ خلافت کا قیام عمل میں لایا جاسکے اور پھر دور خلافت راشدہ سے لے کر سقوطِ خلافت تک کی جانے والی کوششوں کا مقصد یہ رہا کہ خلافت کی حفاظت و توسیع کی جائے، ساتھ ساتھ اس میں پڑ جانے والے رخنوں کو ختم کیا جائے اور عمارت خلافت کی بنیادوں کو نقصان پہنچانے والے مفاسد سے دور رکھا جائے۔

چنانچہ ''قیامِ خلافت'' وہ فریضہ ہے کہ جس کی بنیاد پر تاریخ اسلامی کے ہر دور میں مختلف جماعتیں یا گروہ وجود میں آتے رہے خصوصاً خلافت کے سقوط سے قبل اس کے غیر موثر ہونے کی وجہ سے وجود میں آئے، جن میں تحریک شہیدین، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور تحریک ریشمی رومال قابلِ ذکر ہیں۔ پھر خلافت کے سقوط کے بعد تو اس فریضہ کی ادئیگی کا جذبہ مسلمانوں کے اندر اور تیزی سے سرائیت کر گیا اور بلادِ اسلامیہ کے اندر اعلاء کلمۃ اللہ اور خلافت کے قیام کے لئے تحریکیں اور جماعتیں وجود میں آئیں جنہوں نے مسلمانوں کے اندر اس نظریہ کے عام کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ جن میں برصغیر پاک و ہند میں کھڑی ہونے والی جماعتیں بھی قابل ذکر ہیں۔

چنانچہ یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور وقت کے طاغوتی حکمرانوں کو اپنے مفادات اور اقتدار سے حقیقی خطرہ صرف مسلمانوں کے اِسی طبقے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اوّلاً مسلمانوں میں ایسی تحریکیں وجود میں ہی نہ آئیں اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو ان کی حتی الامکان یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسی تحریکوں کو شرعی منہج یا طریقہ کار سے غیر محسوس طریقے سے ہٹا کر، دوسرے طریقوں اور راستوں کو وقت کی ''حکمت و مصلحت'' اور ''جواز'' کے عنوانات کے ذریعے اختیار کرانے کی کوشش کی جائے۔

اور سقوطِ خلافت کی بعد کی تاریخ شاہد ہے کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا کہ خلافت کے قیام کے لئے نہ جانے امت مسلمہ میں کتنی ہی تحریکیں اور جماعتیں بڑے ہی خلوص واخلاص کے ساتھ کھڑی ہوئیں، مگر اپنوں کی نادانیوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے، ان میں سے اکثر نے شریعت کے بتائے منہج وطریقہ کے بجائے وہ منہج وطریقہ کار اختیار کیا جو کہ ایسے تاریک راستوں کی جانب لے گیا جس کی منزل خلافت نہیں بلکہ امت مسلمہ میں رائج طاغوتی نظام کے تحفظ واستحکام کی صورت میں نکلا۔

لہٰذا ہم عصر حاضر میں اقامت دین کے لئے کھڑے ہونے والی جماعتوں، خاص کر پاکستان میں کام کرنے والی جماعتوں کے منہج وفکر کا جائزہ لیں گے۔ تاکہ مسلمانانِ پاکستان کے سامنے قیامِ خلافت کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے شریعت کے رہنما اصول واضح ہوسکیں جس کی وجہ سے ایک طرف ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجائے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کس تحریک یا جماعت کو اختیار کریں اور دوسری طرف وہ مسلمان جو پہلے ہی کسی اجتماعیت کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کے لئے بھی یہ طے کرنا آسان ہوجائے کہ وہ جس اجتماعیت کے ساتھ ہیں، اس کا منہج اور طریقہ کار شریعت کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قیام خلافت کے لئے اپنے نبی کے بتائے منہج وطریقہ کار کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر ایسے راستے سے بچائے جو کہ گمراہی وضلالت کی طرف لے جانے والا ہے۔ آمین!

نصب العین کا تعین

کسی بھی جماعت کے نصب العین کا تعین بنیادی طور پر دو چیزوں سے ہوتا ہے:

(۱) جماعت کے قیام کا مقصد

(۲) مقصد کے حصول کے لئے طریقہ کار

لٰہذا وہ جماعتیں جن کا مقصد پاکستان میں ''اقامت دین'' یا بالفاظ دیگر شریعت کا نفاذ ہے، ان میں سے چند اہم جماعتوں کے مقصدِ قیام اور مقصد کے حصول کے لئے طریقہ کار کا تجزیہ قرآن و سنت کی روشنی میں سلف صالحین کے فہم پر کریں گے۔

کسی بھی جماعت کے مقصدِ قیام اور اس مقصد کے حصول کے طریقہ کار کو واضح کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس جماعت کے بانی و مؤسس کی زبانی اس کو بیان کیا جائے تاکہ اس جماعت کے نصب العین کا صحیح تعین کیا جاسکے اور اس نصب العین کی شرعی حیثیت بھی واضح ہو سکے۔

جماعت اسلامی کے منہج وفکر کا تجزیہ

جماعت اسلامی کے قیام کا مقصد:

سید ابوالاعلیٰ مودودی جماعت اسلامی کے مؤسس و بانی ہی نہیں بلکہ وہ اس تحریک کے کارکنوں کے لئے ایک روحانی رہنما کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہی کی زبانی ہم اس جماعت کے مقصدِ قیام کو سمجھ لیتے ہیں جس کو انہوں نے اپنی تقاریر و تصانیف میں بارہا بیان کیا ہے۔

دستور جماعت اسلامی کی دفعہ ۴ میں اس جماعت کا نصب العین یہ درج ہے:

''جماعت اسلامی پاکستان کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود اقامت دین (حکومت الٰہیہ یا اسلامی زندگی کا قیام)اور حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کا حصول ہو گا''۔(دستور جماعت اسلامی پاکستان ص14)

اگست 1941ء میں کا پہلا اجتماع جس میں جماعت اسلامی کی داغ بیل ڈالی گئی اس میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں:

''یہ بات ہر اس شخص کو جو جماعت اسلامی میں آئے، اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو کام اس جماعت کے پیش نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظام زندگی کو بدلنا ہے۔ اسے دنیا کے اخلاق، سیاست، تمدن، معیشت، معاشرت ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا میں نظام حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے''۔(روداد اجتماع اول، اقتباس از ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل'' ص30)

1945ء میں جماعت اسلامی کے اجتماع میں ایک تقریر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں:

''ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے،یعنی دنیامیں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق وفجار کی امامت و قیادت ختم ہوکر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اس سعی وجہد کو ہم رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں........دراصل فساق وفجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ دنیاکے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہو''۔(اقتباس از ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل'' ص34)

مئی 1947ء میں جماعت اسلامی کے اجتماع میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک مفصل تقریر کی جو کہ ''جماعت اسلامی کی دعوت'' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے ۔اس میں جماعت اسلامی کے مقصدِ قیام کو بیان کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں:

''موجودہ تہذیب ، جس پر آج دنیا کا پورا فکری ،اخلاقی ،تمدنی،سیاسی اور معاشی نظام چل رہاہے، دراصل تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے:لادینی، قوم پرست اور جمہوریت۔ جماعت اسلامی جس مقصد کے لئے کام کررہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سارا نظام زندگی چلتا رہے انہی بنیادوں پر، مگر اس کے چلانے والے ہاتھ انگریزوں کے ہاتھ نہ رہیں بلکہ ہندستانی یا مسلمان قوم کے ہاتھ ہوجائیں۔اس کے برعکس جماعت اسلامی یہ چاہتی ہے کہ اس پورے نظام زندگی کو ان بنیادوں سے اکھاڑ کر تین دوسری بنیادوں پر قائم کیا جائے:لادینی کے مقابلے میں خدا کی بندگی و اطاعت، قوم پرستی کے مقابلے میں انسانیت، اور جمہور کی حاکمیت کے مقابلے میں خدا کی بندگی و اطاعت''۔(اقتباس از''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل''ص36)

جماعت اسلامی کے مقصدِ قیام کے حصول کے لئے طریقہ کار کا تعین:

جماعت اسلامی کے دستور کی دفعہ 5 میں جماعت کے طریق کار کے تحت یہ لکھا گیا:

''جماعت کا مستقل طریق کار یہ ہو گا:

۱۔ وہ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھے گی کہ خدا اور رسول کی ہدایت کیا ہے۔ دوسری ساری باتوں کو ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھے گی جہاں تک اسلام میں اس کی گنجائش ہو گی۔

۲۔ اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لئے جماعت کبھی ایسے ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کرے گی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو۔

۳۔ جماعت اپنے پیش نظر اصلاح اور انقلاب کے لئے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی۔ یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعہ سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے گی اور رائے عامہ کو ان تغیرات کے لئے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیش نظر ہیں۔

۴۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کرے گی بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی۔ (دستور جماعت اسلامی پاکستان ص 15)

فروری 1975ء جماعت کے ارکان کے اجتماع عام بہاولپور میں ماچھی گوٹھ کے مقام پر منعقد ہوا جس میں جماعت کے آئندہ لائحہ عمل کے متعلق واضح اور قطعی طریقہ معین کیا گیا۔ اس ضمن میں سید ابو الاعلیٰ مودودی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں جماعت کے طریقہ کار کا تعین یوں کیا گیا:

''علاوہ بریں چوں کہ جماعت اسلامی اپنے دستور کی رو سے اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لئے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے اور پاکستان میں اس اصلاح و انقلاب کے عملاً رونما ہونے کا ایک ہی آئینی راستہ ہے اور وہ ہے انتخابات کا راستہ، اس لئے

جماعت اسلامی ملک کے انتخابات سے بے تعلق تو بہر حال نہیں رہ سکتی۔خواہ وہ ان میں بلاواسطہ حصہ لے یا بالواسطہ یا دنوں طرح"۔ (اقتباس از"تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل"ص 11)

پھر اس قرارداد کے اس حصے"جماعت اسلامی ملک کے انتخابات سے بے تعلق تو بہر حال نہیں رہ سکتی۔خواہ وہ ان میں بلاواسطہ حصہ لے یا بالواسطہ یا دنوں طرح"کی وضاحت سید ابوالاعلیٰ مودودی "تبدیلی قیادت کاواحد راستہ،انتخابات"کے ضمن میں کہتے ہیں:

"اس معاملے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لئے تین حقیقتیں واضح طور پر آپ کی نگاہ میں رہنی چاہئیں:

پہلی یہ کہ آپ اس ملک میں اسلامی نظام زندگی عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے۔دوسری یہ کہ آپ جس ملک میں کام کررہے ہیں وہاں ایک آئینی وجمہوری نظام قائم ہے اور اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک ہی آئینی راستہ ہے ....انتخابات

تیسری یہ کہ آئینی وجمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلی قیادت کے لئے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لئے جائز نہیں ہے اور اسی بناء پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیش نظر اصلاح وانقلاب کے لئے آئین وجمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔

ان تین حقیقتوں کو ملاکر جب آپ غور کریں گے تو بالکل منطقی طور پر ان سے وہی نتیجہ نکلے گا جو قرارداد میں بیان کیا گیاہے۔آپ انتخابات میں آج حصہ لیں یا دس،بیس،پچاس برس بعد بہر حال،اگر آپ کو یہاں کبھی اسلامی نظام زندگی قائم کرنا ہے تو راستہ آپ کو انتخابات ہی کا اختیار کرناپڑے گا"۔(اقتباس از"تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل"ص 138)

"ہمارا ملک جس جمہوری طرز پر چل رہا ہے، اس میں نظام زندگی کی تبدیلی لانے کے لئے بہر حال یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے ارکان اور متفقین کی ایک کثیر تعداد عملاً اس جمہوری طرز حکومت کی پوری مشینری سے واقف ہو اور اس کے کام کو چلانے میں مہارت پیدا کرے۔ یہ واقفیت اور مہارت کہیں باہر سے نہیں لائی جاسکتی، اسی کام (جمہوریت اور انتخابات) میں پڑ کر بتدریج پیدا کی جاسکتی ہے۔ انتخابی کام کے تجربہ کار خود انتخابات ہی میں تیار ہوں گے"۔ (اقتباس از "تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل" ص126)

اس سے پہلے کہ جماعت کے مقاصد یا نصب العین اور طریقہ کار کا شرعی طور پر جائزہ لیا جائے، ہم یہ دیکھ لیتے ہیں کہ کہیں خود جماعت کے نصب العین اور طریقہ کار ہی میں واضح تضادات تو موجود نہیں کیونکہ جب مقصد اور طریقہ کار میں ہی کھلم کھلا تضادات پائے جاتے ہوں تو پھر کسی بھی چیز کے مقصد کا حصول تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

جماعت کے مقصدِ قیام اور طریقہ کار میں تضادات:

کوئی بھی صاحب عقل و دانش اگر جماعت کے مقاصد یا نصب العین کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے طریقہ کار کو دیکھے تو اس کے سامنے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ جماعت کے مقصدِ قیام اور طریق کار میں ہی واضح اور کھلم کھلا تضادات موجود ہیں جو کہ جماعت کے قیام کے مقصد ہی کو فوت کر دیتے ہیں۔ وہ تضادات کیا ہیں ان کو سامنے رکھ لیتے ہیں:

پہلا بنیادی تضاد: نظام کی تبدیلی سے متعلق

جیسا کہ ہم ابھی پڑھ آئے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر جماعت کے قیام کا مقصد دنیا میں رائج نظام کو بدلنا ہے چنانچہ جو بھی شخص جماعت میں شامل ہو اس کے لئے وہ لازم سمجھتے ہیں کہ:

"اسے دنیا کے پورے نظام زندگی کو بدلنا ہے........ **دنیا میں نظام حیات خدا سے بغاوت** پر قائم ہے اسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے"۔

پھر ان کے نظر میں دنیا میں چلنے والے نظام کی تین بنیادیں ہیں:

"موجودہ تہذیب، جس پر آج دنیا کا پورا فکری، اخلاقی، تمدنی، سیاسی اور معاشی نظام چل رہا ہے، دراصل تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے: لادینی، قوم پرست اور جمہوریت"۔

پھر وہ جماعت کے مقصدِ قیام کی وضاحت کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ:

"جماعت اسلامی جس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سارا نظام زندگی چلتا رہے انہی بنیادوں پر، مگر اس کے چلانے والے ہاتھ انگریزوں کے ہاتھ نہ رہیں بلکہ ہندستانی یا مسلمان قوم کے ہاتھ ہو جائیں"۔

پھر اس کی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں:

"اس کے برعکس جماعت اسلامی یہ چاہتی ہے کہ اس پورے نظام زندگی کو ان بنیادوں سے اکھاڑ کر تین دوسری بنیادوں پر قائم کیا جائے: لادینی کے مقابلے میں خدا کی بندگی واطاعت، قوم پرستی کے مقابلے میں انسانیت، اور جمہور کی حاکمیت کے مقابلے میں خدا کی بندگی واطاعت"۔

پھر جماعت کے دستور میں یہ بات درج ہے کہ جماعت ہر ایسے ذرائع اور طریقوں سے اجتناب کرے گی جو کہ "فساد فی الارض" کی صورت میں دنیا میں رائج ہوں گے:

"اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لئے جماعت کبھی ایسے ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کرے گی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو"۔

اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ دنیامیں نظام حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے، اور یہ کہ دنیا کے پورے نظام زندگی کو بدلنا ہے، اور یہ کہ موجودہ تہذیب کا نظام حیات تین بنیادوں پر کھڑا ہے جس میں سے ایک "جمہوریت" ہے، اس کے علاوہ یہ کہ ان تمام امور پر اس عزم کا اظہار کہ جماعت اسلامی جس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سارا نظام زندگی چلتا رہے انہی بنیادوں پر، اور یہ کہ جماعت اسلامی یہ چاہتی ہے کہ اس پورے نظام زندگی کو ان بنیادوں سے اکھاڑ کر تین دوسری بنیادوں پر قائم کیا جائے (جن میں سے ایک)جمہور کی حاکمیت کے مقابلے میں خدا کی بندگی و اطاعت، اور یہ کہ جماعت کبھی ایسے ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کرے گی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو، لیکن ان تمام حقیقتوں اور عزائم کے اظہار کے باوجود جماعت اسلامی نے اپنا لائحہ عمل اور طریقہ کار اسی نظام حیات سے مستعار لیا جو کہ خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور جس کی بنیادی ستونوں میں سے ایک "جمہوریت" ہے جو کہ زمین پر فساد فی الارض کی آج سب سے بڑی علامت ہے۔

چنانچہ "جمہوریت" کو تہذیب حاضر کا بنیادی ستون ماننے کے باوجود جماعت کے طریق کار سے متعلق ذرا درج ذیل الفاظ کو دوبارہ غور سے پڑھیئے، آپ کو خود بہ خود جماعت کے مقصدِ قیام اور طریق کار میں واضح تضاد نظر آجائے گا:

.........جماعت اپنے پیش نظر اصلاح اور انقلاب کے لئے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی۔

........علاوہ بریں چونکہ جماعت اسلامی اپنے دستور کی رو سے اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لئے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے اور پاکستان میں اس اصلاح وانقلاب کے عملاً رونما ہونے کا ایک ہی آئینی راستہ ہے اور وہ ہے انتخابات کا راستہ۔

........ہمارا ملک جس جمہوری طرز پر چل رہا ہے، اس میں نظام زندگی کی تبدیلی لانے کے لئے بہر حال یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے ارکان اور متفقین کی ایک کثیر تعداد عملاً اس جمہوری طرز حکومت کی پوری مشینری سے واقف ہو اور اس کے کام کو چلانے میں مہارت پیدا کرے۔ یہ واقفیت اور مہارت کہیں باہر سے نہیں لائی جاسکتی، اسی کام میں پڑ کر بتدریج پیدا کی جاسکتی ہے۔

........آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلی قیادت کے لئے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لئے جائز نہیں ہے۔

یعنی یہ کہ جس نظام حیات سے بغاوت کے لئے کھڑے ہوئے اور جس نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کا عزم لے کر میدان آنے کا اعلان کیا لیکن دوسری طرف طریق کار میں اس ہی نظام کی ایک بنیاد........جمہوریت اور انتخابات........کا اپنے آپ کو دستوری طور پر پابند کر دیا۔ واللہ! یہ کیسی خود فریبی اور بے عقلی ہے کہ جس نظام کو جڑ سے اکھاڑنا جماعت کا مقصد ٹھہرا تھا اسی نظام کی بنیادوں کو مضبوط کرنا جماعت کا دستوری طریق کار ٹھہرا۔

یہ ہے سب سے بنیادی تضاد جو کہ خود جماعت کے مقصدِ قیام اور طریق کار میں پایا جاتا ہے جو کہ جماعت کے مقصدِ قیام کو ہی فوت کر دیتا ہے اور مقصد کے حصول کے لئے کی جانے والی ساری محنتوں کو لاحاصل اور رائیگاں کر دیتا ہے۔ نتیجتاً ساری سعی و جد وجہد غیر شعوری طور پر خدا کی بغاوت پر قائم نظام

حیات کو اکھاڑنے کے بجائے اس کو مضبوط کرنے میں لگ جاتی ہیں اور نظام باطل مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسرا بنیادی تضاد: اقامت دین سے متعلق

اب ہم دوسرے لحاظ سے جماعت کے مقصدِ قیام اور اس کے طریق کار میں بیان کردہ واضح تضاد کو سمجھیں گے۔

اگست 1952ء میں جماعت کے پیش کردہ دستور کی تشریح میں فریضۂ اقامت دین کی تعریف یوں کی گئی:

> ”اقامت دین سے مقصود دین کے کسی خاص حصے کی اقامت نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اقامت ہے، خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے، نماز، روزے اور حج وزکوٰۃ سے ہو یا معیشت و معاشرت اور تمدن و سیاست سے“۔(اقتباس از ”تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل“ص28)

پھر اسی دستور کی تشریح میں فریضۂ اقامت دین کو بندۂ مومن کی دنیاوی و اخروی نجات کا لازمی حصہ قرار دیتے ہوئے کہا گیا:

> ”اگرچہ مومن کا اصل مقصد زندگی رضائے الٰہی کا حصول اور آخرت کی فلاح ہے، مگر اس مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں خدا کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لئے مومن کا عملی نصب العین اقامت دین اور حقیقی نصب العین وہ رضائے الٰہی ہے جو اقامت دین کی سعی کے نتیجے میں حاصل ہوگی“۔(اقتباس از ”تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل“ص28)

لہٰذا اسی فریضہ کے پیش نظر سید ابوالاعلیٰ مودودی جماعت اسلامی کے قیام کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بدلنا ہے۔ یہ کلی و اساسی تغیر صرف اسی طریقے پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا........ لہٰذا اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی جماعت ہو اور اسلامی نصب العین کے لئے اسلامی طریقے پر کام کیا جائے۔ اسی بناء پر شعبان 1360ء (اگست 41ء) میں اُن لوگوں کا اجتماع منعقد کیا گیا ہے جو صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے کے خواہشمند ہیں اور باہمی مشورے سے ''جماعت اسلامی'' کی بنا ڈالی گئی''۔ (اقتباس از ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل'' ص27)

1951ء میں جماعت نے اپنا جو منشور پیش کیا تھا اس میں واضح طور پر یہ لکھا تھا کہ:

''یہ جماعت نوع انسانی کے لئے فلاح کی صرف ایک ہی صورت دیکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور گوشوں سمیت خدائے واحد کی بندگی و اطاعت کے اصول پر قائم ہو، اس بندگی و اطاعت کے لئے انبیاء علیہم السلام کی اس راہ نُمائی کو سند مانا جائے جو آج صحیح و کامل صورت میں صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی میں موجود ہے''۔ (اقتباس از ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل'' ص29)

ذرا پھر غور فرمایئے! اس اقرار و اظہار پر کہ:

.... اقامت دین سے مقصود دین کے کسی خاص حصے کی اقامت نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اقامت ہے۔

.........لہٰذا اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی جماعت ہو اور اسلامی نصب العین کے لئے اسلامی طریقے پر کام کیا جائے۔

.........اس راہ نُمائی کو سند مانا جائے جو آج صحیح و کامل صورت میں صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی میں موجود ہے۔

لیکن اس کے باوجود شریعت کی جانب سے عائد کردہ اقامت دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے شرعی طریقے کو اختیار کرنے کے بجائے جدید تہذیبِ باطل کے ستونوں میں سے ایک "جمہوریت" کو قرار دینے کے باوجود اس نظام کو یہ کہہ کر اختیار کرلینا کہ:

.........جماعت اپنے پیش نظر اصلاح اور انقلاب کے لئے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی۔

بلکہ اس کو اپنے اوپر لازم کرتے ہوئے کہنا:

.........جماعت اسلامی اپنے دستور کی رو سے اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لئے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے۔

اور اس پر ستم در ستم یہ کہنا:

.... آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلی قیادت کے لئے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لئے جائز نہیں ہے۔

کیا جماعت کے مقصدِ قیام اور طریق کار میں کھلا تضاد نہیں؟

جس طرح شریعت نے نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ کی ادائیگی، نظام سیاست سے لے کر نظام معیشت کو چلانے کے لئے نہ صرف مکمل رہنمائی دی ہے بلکہ ان تمام امور کی ادائیگی کے لئے ایک عملی طریق کار بھی مقرر کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے انحراف کرنا یا اس کی جگہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا شریعت میں مردود قرار دیا گیا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقامت دین جیسے اہم فریضے، جس پر تمام فریضوں کی مکمل ادائیگی کا دارومدار ہے، اس کے نفاذ کے لئے شریعت نے مکمل رہنمائی دیتے ہوئے کوئی "عملی طریق کار" مقرر نہ کیا ہوگا؟ جس کی وجہ سے جماعت اسلامی "جمہوری نظام" اور اس کے سب سے بڑے مظہر انتخابات کے ذریعے ہی "اقامت دین" کے فریضے کی ادائیگی کے لئے نہ صرف بضد ہے بلکہ اس طریقہ کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ واللہ! یہ تو بہت بڑی نادانی اور خسران کی بات ہے جس پر لوگ عمل پیرا ہیں۔

چنانچہ یہ ہے دوسرا بنیادی تضاد جو کہ فریضہ اقامت دین کے تناظر میں جماعت کے مقصدِ قیام اور طریق کار کے بیان میں سامنے آتا ہے۔

ایک تلخ حقیقت:

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے 1941ء میں جب جماعت کی بنیاد ڈالی تو اس وقت دنیا میں رائج نظام باطل اور اس کے بنیادی ستون ....جمہوریت اور انتخابات.........کے حوالے سے ان کے جو افکار و خیالات تھے، اُس کو پڑھ کر ایک عام آدمی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی بظاہراً جمہوریت اور انتخابات کی برائیوں سے بخوبی واقف تھے اور وہ اس کو فساد فی الارض میں ہی شمار کرتے تھے۔

چنانچہ ووٹ اور الیکشن سے متعلق اپنے مؤقف کو ایک موقع پر واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام "حاکمیت جمہور" پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں، یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لئے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت، جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کا مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز"۔ (سہ روزہ "کوثر" 28 اکتوبر 1945ء صفحہ 3 بحوالہ تحریک آزادی ہند اور مسلمان)

مئی 1947ء میں جماعت کے اجتماع کے موقع پر کی جانی والی تقریر میں انہوں نے کہا:

"موجودہ زمانے کی بے دین قومی جمہوریت تمہارے دین و ایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ تم اس کے آگے سر تسلیم خم کروگے تو قرآن سے پیٹھ پھیروگے۔ اس (جمہوریت) کے قیام و بقامیں حصہ لوگے تو اپنے رسول سے غداری کروگے۔ اس (جمہوریت) کا جھنڈا اڑانے کے لئے اٹھوگے تو اپنے خدا کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کروگے۔ جس سے اسلام کے نام پر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو اُس (دین) کی روح اِس ناپاک (جمہوری) نظام کی روح سے، اُس کے بنیادی اصول اِس کے بنیادی اصولوں سے اور اُس کا ہر جز اِس کے ہر جز سے بر سر جنگ ہے۔ اسلام اور یہ (جمہوری) نظام کہیں ایک دوسرے سے مصالحت نہیں کرتے۔ جہاں یہ (جمہوری) نظام بر سر اقتدار ہو گا وہاں اسلام نقش بر آب رہے گا اور جہاں اسلام بر سر اقتدار ہو گا وہاں اس (جمہوری) نظام کے لئے کوئی جگہ نہ ہو گی۔ تم اگر واقعی اسی اسلام پر

ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے تو تمہارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو اس قوم پرستانہ لادینی جمہوریت کی مزاحمت کرو اور اس کے مقابلے خدا پرستانہ انسانی خلافت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرو۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں تک (مسلمان) بحیثیت ایک قوم برسر اقتدار ہو وہاں تو اگر تمہارے ہاتھوں سے اسلام کے اصلی نظام کے بجائے یہ کافرانہ (جمہوری) نظام بنے اور چلے تو حیف ہے تمہاری اس مسلمانی پر جس کا نام لینے میں تم اتنے بلند آہنگ اور جس کا کام کرنے سے تم اس قدر بیزار ہو"۔

اسی طرح ایک اور جگہ سید ابوالاعلیٰ مودودی "جمہوری انتخابات" کی شناعت کو مثال دے کر یوں سمجھاتے ہیں:

"جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہو گا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وہی لوگ برسر اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سند مقبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ گمان کرتے ہیں اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے گی (تو) ان کا یہ گمان غلط ہے۔ دراصل اس نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔ اس کا نام حکومت الٰہیہ رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے"۔ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم ص142)

پھر تقسیم ہند سے پہلے جو گروہ یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کروا کر کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو ایک لادینی ہی سہی، قومی اور جمہوری حکومت قائم کر دی جائے تو اس کا خود سید ابوالاعلیٰ مودودی نے رد

سختی کے ساتھ جن الفاظ میں کیا تھا، وہ آج بھی آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں اور جماعت کے لوگوں کے لئے عبرت و بصیرت کا سامان ہیں۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی کہتے ہیں:

''ایک گروہ یہ راستہ تجویز کر رہا تھا کہ پہلے ایک قوم پرستانہ تحریک کے ذریعہ سے قوم پرستی ہی کے معروف اور چلتے ہوئے طریقوں پر کام کر کے مسلمانوں کی ایک لادینی ہی سہی، قومی و جمہوری ریاست قائم کر دینی چاہیے، پھر اسے اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کا ذریعہ بنائیں گے اور جمہوری انتخابات کے واسطے سے اس کو اسلامی ریاست و حکومت میں تبدیل کر دیں گے۔ میرا استدلال اس کے جواب میں یہ تھا:

ا۔ یہ پھیر کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے آپ آغاز ہی میں براہ راست اسلامی حکومت قائم کرنے کا وہ راستہ کیوں نہ اختیار کریں جو اس مقصد تک پہنچنے کا فطری راستہ ہے۔

۲۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کی قومی حکومت کا قیام اسلامی نظام حکومت کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے، یا اس کا مفید ذریعہ بن سکتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ چیز الٹی مانع و مزاحم ہوتی ہے اور بسا اوقات کافروں کی حکومت سے زیادہ کامیاب مزاحمت کرتی ہے۔

۳۔ یہ خیال کرنا بھی صحیح نہیں ہے اس وقت انتخابات کے ذریعہ سے نظام حکومت کو تبدیل کرنا نسبتاً کوئی آسان کام ہو گا۔ دراصل اُس وقت بھی اصلاح کے لئے وہ سارے پاپڑ بیلنے پڑیں گے جو آج یعنی 40ء میں براہ راست اسلامی نظام حکومت کے قیام کی کوشش میں بیلنے ہوں گے اور اس وقت بھی اس راہ میں ویسی ہی مزاحمتیں ایک بگڑا ہوا مسلمان برسر اقتدار طبقہ کرے گا جیسے آج کفار کر رہے ہیں۔ اس لئے اگر یہ سب کچھ اُس وقت بھی پیش آنا ہے تو ہم آج ہی سے وہ کام کیوں نہ شروع کر دیں جس سے دراصل اسلامی حکومت قائم ہوا کرتی ہے اس درمیانی چیز کے قیام میں اپنی قوتیں کیوں صرف کریں جب

کہ اسے مدد گار نہیں بلکہ مزاحم ہی بننا ہے"۔ (اقتباس از"تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل"ص74تا)

لیکن نہ جانے وقت کے بہتے دھارے کے ساتھ کیا ہوا کہ چیزوں کو پرکھنے اور جانچنے کے معیار ہی بدل گئے۔ جو جمہوریت اور انتخابات تقسیم ہند سے پہلے فساد فی الارض کا سب بڑا مظہر اور موٗجب تھے، پاکستان بنتے ہی سارے مسائل کا واحد اور مستقل حل قرار پائے، گویا جو چیز زہر قاتل تھی بعد میں وہی آب حیات ٹھری۔

گو کہ جمہوریت اور انتخابات سے متعلق جو نظریات سید ابوالاعلیٰ مودودی کے شروع میں تھے اس میں تقسیم ہند سے ماقبل ہی تبدیلی آنی شروع ہوگئی تھی اور وہ اس کو مباحات کے دائرے میں شامل کر چکے تھے مگر تقسیم ہند کے بعد تو اس کو اپنی جماعت کے لئے لازم قرار دے کر یہ کہتے ہوئے جمہوریت اور انتخابات کے گورکھ دھندے میں کود پڑے کہ:

"تبدیلی قیادت کے لئے آپ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اس گندے کھیل میں پاکیزگی کے ساتھ آیئے......... جعلی ووٹ کے مقابلے میں اصل ووٹ لایئے......... دھونس اور زبردستی ووٹ لینے والوں کے مقابلے میں ایسے ووٹر پیش کیجئے جو بے خوف ہو کر اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دیں......... دھاندلیوں کے مقابلے میں ٹھیٹھ ایمانداری برت کر دکھایئے۔ ایک دفعہ نہیں، دس دفعہ ناکامی ہو تو ہو۔ آپ کوئی تبدیلی یہاں لاسکتے ہیں تو اسی طریقے سے لاسکتے ہیں "۔(اقتباس از"تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل"ص152)

اور اس گندے کھیل میں شامل ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوری انتخابات میں کامیابی کے لئے رافضی شیعوں سے بھی مفاہمت کرنی پڑی جو کہ امت مسلمہ کے لئے ہمیشہ ایک ناسور ثابت ہوئے ہیں اور جن کی گمراہی کے بارے میں مشہور تابعی امام عامر الشعبی رحمہ اللہ نے فرمایا تھا:

”میں تمہیں گمراہ اور خواہش پرستوں سے ڈراتا ہوں اور ان میں شریر ترین“ رافضہ ”ہیں۔ یہ لوگ اسلام میں کسی رغبت و خوف کی بنا پر داخل نہیں ہوئے بلکہ یہ اسلام میں بغض و عداوت کے لیے داخل ہوئے“۔(منهاج السنة النبوية لابن تيمية رحمه الله، فصل؛ مشابهة الرافضه لليهود والنصارىٰ من وجوه كثيره)

مگر سید ابوالاعلیٰ مودودی رافضیوں سے متعلق جماعت کی پالیسی کو یوں بیان کرتے ہیں:

”جماعت اسلامی شیعہ حضرات کی مخالف نہیں ہے اور اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہنے چاہیے، اہل تشیع کئی مواقع پر جماعت کے ساتھ تعاون کر چکے ہیں اور جماعت اسلامی نے گزشتہ 23 سالوں میں شیعہ برادری کے خلاف کوئی کام نہیں کیا“۔(روزنامہ جسارت کراچی 17 جون 1970 بحوالہ حبل اللہ نمبر 10 ص 35)

یہاں تک کہ ان رافضیوں کے لئے فراخی کا عالم یہ ہوا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک رافضی کو خط لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

” میں نہ آپ سے شیعہ عقائد و مسلک چھوڑنے کا مطالبہ کرتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے سنی عقیدہ و مسلک چھوڑنے کا مطالبہ کریں۔ سنی اور شیعہ ہوتے ہوئے ہم مسلمان ہیں اور اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں۔ آپ خلافت راشدہ کو قبول نہیں کر سکتے، نہ کیجئے۔ کوئی آپ سے مطالبہ نہیں کرتا کہ آپ پہلے تین خلفاء کو مان لیں“۔(مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ دوم صفحہ 277)

بالآخر یہ نتائج نکلے اس گندے کھیل میں پڑنے کہ ووٹ بینک مضبوط کرنے کے چکر میں ناموس صحابہ کا بھی سودا کر ڈالا۔

خلاصہ یہ کہ جس سعی لاحاصل سے لوگوں کو ایک عرصے تک ڈراتے رہے اور مقصد تک پہنچنے کا فطری راستہ اختیار کرنے اور براہ راست اسلامی حکومت قائم کرنے کی طرف لوگوں کو بلاتے رہے اور بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی کہ:

"تجربات شاہد ہیں کہ حقیقی جمہوریت آج تک دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکی اور عقلی دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا عملاً محال ہے"۔(حاشیہ قدیم "اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین" بحوالہ تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم ص95)

اس کے باوجود بلاآخر خود ہی اس سعی لاحاصل میں جت گئے اور اپنی پوری جماعت کو اس ہی نظام کا پابند کر دیا جس کو دوسرے گروہوں لئے سم قاتل سمجھا جاتا رہا۔ کیا خوب کہا تھا کسی شاعر نے:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اور تو اور پہلے خود سید ابوالاعلیٰ مودودی نے .... جمہوریت اور انتخابات .... میں حصہ لینے کے عمل کو دین ایمان کے قطعاً خلاف، قرآن سے منہ پھیرنے، رسول سے غداری، خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے مترادف قرار دیا، لیکن بعد میں اسی جمہوری طرز عمل کو یہ تاویل کرتے ہوئے اختیار کر لیا کہ:

"40ء میں جو راستہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے میں نے پیش کیا تھا، مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اس کو اختیار نہ کیا۔ وہ اسی "درمیانی چیز" کے لئے کوشاں رہے جسے میں نے پھیر کا راستہ کہا تھا۔ حتیٰ کہ بالآخر وہ لادینی جمہوری قومی ریاست پاکستان قائم ہو گئی......... مگر کیا اس کا یہ مطلب تھا، یا اب لینا درست ہے کہ وہ درمیانی چیز جب قائم ہو جائے تو ہمیں اس کو اسلام کی راہ میں اتنا ہی اور ویسا ہی سخت مزاحم بن جانے دینا چاہیے جس کا خدشہ ہم نے

ظاہر کیا تھا اور اسے اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے"۔(اقتباس از"تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل"ص77اور78)

اس کے ساتھ ساتھ جمہوری نظام کو اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی:

"بے شک میں نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمانوں کی قومی جمہوری ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنا سخت مشکل کام ہو گا، کیوں کہ عام رائے دہندوں کو گمراہ کر کے نہایت بد کردار لوگ بر سر اقتدار آجائیں گے اور وہ کفار سے بھی زیادہ جسارت کے ساتھ اسلام کی راہ روکنے کی کوشش کریں گے........ مگر کیا اس سے یہ استدلال کرنا درست ہے کہ جب اس طرح کی ریاست وجود میں آجائے تو ہمیں بد کرداروں ہی کے ہاتھ میں اسے چھوڑ دینا چاہیے اور جمہوری طریقوں سے اس کی قیادت تبدیل کرنے کی کوشش کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے"۔(اقتباس از"تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل"ص78)

لیکن آج وقت نے بھی یہ ثابت کردیا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی........جمہوریت اور انتخابات........سے متعلق تقسیم ہند سے پہلے کی اختیار کردہ رائے نہایت درست تھی اور اپنی پہلی رائے کے برخلاف دوسری رائے اختیار کرنے میں وہ واضح طور پر ٹھوکر کھا گئے۔

کیونکہ سقوط خلافت سے پہلے مسلمانوں میں کوئی بھی جمہوریت کے نام تک سے واقف نہ تھا البتہ اس کے بعد آج تک نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مطابق کہ "موجودہ تہذیب کے تین بنیادی ستونوں میں سے ایک جمہوریت ہے" کہ راستے سے دینی جماعتوں کی اول تو کوئی مستحکم حکومت وجود میں نہیں آسکی اور اگر کوئی اس راستے سے کامیاب بھی ہوا تو اس کو حکومت قائم ہی نہیں کرنے دی گئی جیسا کہ ماضی میں الجزائر میں ہوا، یا جلد ہی اس کی حکومت کو"غیر آئینی" قرار دے کر گرا دیا گیا جیسا کہ ماضی میں فلسطین میں حماس کی حکومت کے ساتھ ہوا، اور اگر کسی جگہ یہ معجزہ رونما ہو بھی گیا جیسا کہ ماضی میں صوبہ سرحد میں ایم ایم اے، اور اب فلسطین میں حماس اور مصر میں اخوان

المسلمون کی حکومت، تو کسی ایک جگہ نہ ہی حدود اسلامی میں سے کسی ایک حد کا اجراء ہو سکا اور نہ ہی ان ممالک کی عدالتوں میں مروجہ آئین و دستور کے مقابلے میں کتاب وسنت کو آخری سند کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ بہر حال جو صاحب بصیرت بھی ''حکومت الٰہیہ'' کے مفہوم سے واقف ہو، وہ ان تمام حکومتوں کے موجودہ طرز عمل کو دیکھ کر ان کو مسلمانوں کی ''کافرانہ حکومت'' تو قرار دے سکتا ہے، حکومت الٰہیہ قرار نہیں دے سکتا۔

چند بنیادی سوالات:

پاکستان بننے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی جماعت کے لئے جمہوری راستے کو نہ صرف اس کو اختیار کرنے بلکہ اس کو ہی واحد راستہ قرار دینے کی جو وجوہات اور دلائل دیئے ہیں، اس کے دو بنیادی نکات ہیں:

(1)........''40ء میں جو راستہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے میں نے پیش کیا تھا ، مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اس کو اختیار نہ کیا''۔

(2)........''جب اس طرح کی ریاست وجود میں آجائے تو ہمیں بدکرداروں ہی کے ہاتھ میں اسے چھوڑ دینا چاہیے اور جمہوری طریقوں سے اس کی قیادت تبدیل کرنے کی کوشش کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے''۔

یہ تھی دو وجوہات جن کی بناء پر سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ جمہوری راستہ اختیار کیا! لیکن اس ضمن میں کچھ سوالات از خود پیدا ہوتے ہیں:

........کیا نظام جمہوریت جو کہ فی نفسہ تہذیب باطل کی کوکھ سے برآمد ہوا ہو اور اپنے ساتھ کئی قباحتیں لئے ہو اور شرعی طور پر جس کی کوئی گنجائش بھی نہ ہو اور اس کو خود سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی ''گندا کھیل'' قرار دیتے ہوں، تو پھر کیسے اس کے ذریعے شریعت کا نفاذ کیا جا سکتا ہے؟

.........پھر جو لوگ تقسیم ہند سے پہلے جمہوری طریقے کو اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ایک خطۂ زمین کے حصول میں استعمال کرنا چاہتے تھے، سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کے اس عمل کو دین ایمان کے قطعاً خلاف، قرآن سے منہ پھیرنے، رسول سے غداری، خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا قرار دیا لیکن تقسیم ہند کے بعد خود اسی راستے پر گامزن ہوگئے! کیا ان کا یہ طرز عمل شرعی طور پر درست تھا؟

.........سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تقسیم ہند سے پہلے اسلامی ریاست کے قیام کے لئے جمہوری عمل کو غلط اس وجہ سے بھی قرار دیا تھا کہ ایسا کرنے والے دینی اعتبار سے لادین اور سیکولر مزاج کے حامل تھے اور ساتھ میں مسلمانوں کی اکثریت بھی دینی علم اور احکامات سے ناواقف تھی، اور ان کی نظر میں اس کے نتیجے میں ایک لادین ریاست ہی وجود میں آسکتی تھی۔ اور پھر حقیقت میں جب سب کچھ ایسا ہی ہوا یعنی جب مسلمانوں کی وجود میں آنے والی نئی ریاست کی باگ دوڑ اسی لادین طبقے کے ہاتھ میں آگئی اور عوام الناس کے دینی حالات میں بھی کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا، تو ایسی صورتحال میں اسلامی ریاست کے قیام اور اس کے حصول کے لئے جمہوری عمل کو اپنے لئے کیسے جائز قرار دے دیا؟

.........سب سے آخری اور بنیادی سوال جس کے جواب کی وضاحت لازمی طور پر ضروی ہے کہ جب مسلمانوں کی ریاست کا نظم و نسق لادین اور فساق وفجار کے ہاتھ میں آجائے تو کیا شریعت نے اس صورتحال کے متعلق کوئی واضح طریقہ کار معین نہیں کیا کہ جس کی بناء پر جمہوری نظام جیسے گندے کھیل کو اختیار کرلیا گیا؟

جمہوریت کے حوالے سے ایک اعتراض اور اس کا جواب:

نظام جمہوریت کے قائلین (بشمول جماعت کے اراکین) کی جانب سے ان تمام باتوں کے باوجود ایک استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ ہم مغربی جمہوریت کے قائل نہیں اور ہم مغربی جمہوریت کو فساد کی اصل جڑ سمجھتے ہیں، اس کے برعکس ہم "قرآن و سنت کے تابع جمہوریت" کے قائل ہیں اور اس کے مطابق ہی ریاست کے نظم و نسق چلانے کے خواہاں ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ یہ استدلال پیش کرتے

ہیں کہ جمہوری نظام میں کچھ چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہے جو کہ اسلامی نظام سیاست سے مشترک ہیں لہٰذا نظام جمہوریت میں پائی جانے والی برائیوں کو دور کرکے اس کی مشترک چیزوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ان استدلال کا جواب یہ ہے کہ، کیا ''ڈیموکریسی ''یعنی جمہوریت نام کی کسی شے کا ذکر قرآن و حدیث میں ملتا ہے؟ اور کیا یہ اسلامی اصطلاح ہے ؟اور کیا جمہوری نظام میں کچھ چیزیں اسلامی نظام سیاست سے مشترک بھی پائی جاتی ہیں؟اور کیا ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے اسلام نے اصطلاحات اور طریق کار کا اپنا کوئی باقاعدہ نظام وضع نہیں کیا، جس کی وجہ سے جمہوریت کی اصطلاح کو ''اسلامی'' کا لفظ لگاکر اختیار کرنے کی حاجت محسوس کی گئی؟

ہم سب جانتے ہیں کہ ''جمہوریت'' خالصتاً ایک مغربی اصطلاح ہے جس کی اپنی ایک تعریف طے شدہ ہے اور اس کے مطابق ایک طریقہ کار بھی معین ہے۔ جس کا خلاصہ ریاست ہائے امریکہ کے صدر ابراہم لنکن نے یوں کیا جو کہ سب کی نزدیک تقریباً متفقہ ہے:

"Government of the people,by the people,for the people"

''عوام کی حاکمیت، عوام کے ذریعے، عوام پر''

جمہوریت میں دراصل ''حاکمیت'' کا حق عوام کو حاصل ہوتا ہے اور ان کا ہر حکم قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا وہ حاکمیت جو فرعون اور اس جیسے دوسرے بادشاہ ''دعوئے حاکمیت'' کی صورت میں کرتے تھے اب وہ حاکمیت کا دعویٰ ''عوام کی حاکمیت''(Sovereignty of the people) کی صورت میں تبدیل ہوچکا ہے۔

چنانچہ علامہ اقبال اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ''میں جمہوریت کے حوالے سے شیطان کی حکمتِ عملی کو اپنے الفاظ کے پیرائے میں یوں بیان کرتے ہیں:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا خود شناس و خود نگر

چنانچہ عوام کی حاکمیت کی صورت میں عوام کے منتخب نمائندے قانون سازی میں بااختیار ہوتے ہیں۔منتخب نمائندوں کی اکثریت جو قانون چاہے بناسکتی ہے۔اب چاہے امریکہ کی پارلیمنٹ کی اکثریت شراب کو حلال کردے،چاہے برطانیہ کی پارلیمنٹ کی اکثریت(Homosextuality)یعنی مرد کی مرد سے شادی اور عورت کی عورت سے شادی کے جائز ہونے کا بل تالیوں کی گونج میں پاس کردے یا چاہے پاکستان کی پارلیمنٹ کی اکثریت ''حدود اللہ''جو کہ قرآن وسنت میں نصِ قطعی سے ثابت ہیں،اُس میں یکسر تبدیلی کرکے شریعت کی دھجیاں بکھیر دے،یہ تمام اختیار ان کو اس جمہوریت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔

گویا آج کا جمہوری نظام دراصل وہ ''طاغوت'' ہے، جس میں اس بات کی کوئی قید نہیں کہ قانون سازی کرنے والے کون ہیں ؟اور اُن کا قرآن وحدیث کے بارے میں علم کتنا ہے؟وہ کس سیرت و کردار کے حامل ہیں؟اور وہ کن اصولوں اور بنیادوں پر قانون سازی کررہے ہیں؟؟بس اصول ایک ہے ،وہ یہ کہ عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کی اکثریت نے یہ قانون پاس کیا ہے اور بس!

اسی طرح جمہوریت کی ایک تعریف ''اکثریت کی اطاعت'' بھی قرآن وحدیث سے متصادم ہے اور چونکہ جمہوری نظام کا خاصہ یہ ہے کہ اس کفریہ نظام میں عوام کی غالب اکثریت کی رائے کو''معیارِ حق'' تسلیم کیا گیا ہے یعنی عوام کی اکثریت کی جو رائے ہے،وہی حق ہے۔چنانچہ قرآن واضح طور پر اس کفریہ نظام کو یہ کہہ کر رد کردیتا ہے کہ:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾(سورۃ الاعراف:116)
''اور(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر کہا مانیں گے اس اکثریت کا جو زمین میں بستی ہے تو وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے ہٹادیں گے''۔

چنانچہ وہ شخص جو کہ علم شرعی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہو، وہ جانتا ہے کہ ایسا کوئی بھی نظام سیاست جو کہ اس جمہوری طریقہ پر وجود میں آئے اور ریاست کا نظم و نسق اس اصول پر چلایا جائے ،تو ایسا کرنا صریح کفر و شرک ہے جو کسی بھی صورت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول نہیں۔

چنانچہ جمہوری نظام کے برعکس اسلام نے ہمیں "خلافت" کا نظام عطا کیا جس میں حکومت اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کو حاصل ہے۔ وہی ''اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْن'' ہے اور پوری انسانیت اسی کی محکوم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾(سورۃ یوسف:40)

"حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کا ہے"۔

﴿وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾(سورۃالکھف:26)

"اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اپنے حکم کے اختیار میں کسی کو شریک کرتا ہے"۔

اسی طرح شریعت نے ہمیں واضح طور پر صرف اللہ اور اس کے رسول اور شریعت کے دائرے میں اپنے "اولی الامر" کی اطاعت کا حکم دیا ہے نہ کہ "اکثریت کی اطاعت" کرنے کا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾(سورۃ النسآء:59)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں"۔

اسی طرح خلافت میں خلیفۃ المسلمین اللہ کا نائب ہوتا ہے اور وہ قرآن وسنت کے مطابق حکومت کرتا ہے اور کسی بھی معاملے میں وہ "شوریٰ" (وہ لوگ جو قرآن وحدیث کا گہرا علم رکھنے والے ہوں ان

کے مشورہ) کے ذریعے قرآن وحدیث کے دیئے ہوئے دائرے کے اندر رہتے ہوئے کام کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (سورة الحجرات:1)

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (کے مقرر کردہ حدود) سے آگے نہ بڑھو۔ اور (اس معاملے میں) اللہ کی نافرمانی سے بچو"۔

چنانچہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ "خلافت" اور "جمہوریت" دو متصادم نظام حیات ہیں۔ لہٰذا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہی نہیں بلکہ دونوں ایک الگ الگ نظام اور طریقہ کار رکھتے ہیں تو پھر دونوں کو آپس میں خلط ملط کرنے کی جسارت کیوں کی جاتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ "قرآن و سنت کے تابع جمہوریت" پر بضد نظر آتے ہیں ان کا یہ کلمہ اسی طرح مردود ہے جس طرح کوئی یہ کہے کہ "ہم قرآن وسنت کے تابع کفر وشرک کے قائل ہیں"۔

کیا جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کیا جاسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوریت کو "مشرف بہ اسلام" کرنا چاہتے ہیں یا پھر وہ "اسلامی جمہوریت" جیسی مردود اور مفسد اصطلاحات کے قائل ہیں اور اسلام کے سیاسی نظام کو کسی بھی طرح جمہوریت کے سانچے میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے جمہوری نظام کے خدوخال کو اسلامی نظام سیاست کے خدوخال سے ثابت کرنے کے لئے خود ساختہ اور باطل دلائل گڑھتے ہیں تاکہ جمہوری نظام کو شرعی لبادہ اوڑھا سکیں۔ ان کا یہ عمل دو اعتبارات سے باطل اور مردود ہے۔

اوّل یہ کہ جب شریعت کی رو سے کوئی چیز فی الواقع کفر وشرک اور حرام قرار پا جائے تو پھر کسی کو بھی یہ طرز استدلال کرنے کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس کی صفات کو اسلامی عبادات و احکامات کی

صفات سے ملانے کی کوشش کرے۔ جیسے کوئی اگر یہ کہے کہ ''سود'' میں تجارت کے بھی کچھ اوصاف پائے جاتے ہیں تو کیا اس کا یہ طرز استدال قبول کر لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ شریعت نے ایسے استدلال کو رد کر دیا چنانچہ قرآن نے ایسا طرز استدلال کرنے والے کی مثال کو یوں بیان فرمایا:

﴿يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (البقرۃ:275)

''جیسے شیطان نے چھو کر اس کو باؤلا کر دیا ہو''۔

دوم یہ کہ کیا شریعتِ اسلامی کے مقرر کردہ فرائض واحکامات میں کچھ چیزیں اگر کسی اور مذہب کی عبادات و معاملات سے مشترک پائی بھی جائیں تو کیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی اجازت دیں گے کہ اس مذہب کی مقرر کردہ عبادات و معاملات میں سے غلط چیزیں اپنی سمجھ کے مطابق ہٹا کر اس کو، اسی مذہبی نام واصطلاح کے ساتھ اختیار کر لیا جائے؟

اس کی ایک چھوٹی سے مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی یہ کہے کہ نماز میں اور ہندوؤں کی پوجاپاٹ میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ نماز اور پوجاپاٹ دونوں میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں چنانچہ جب ان دونوں چیزوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے لہٰذا ہم آج سے نماز میں اسی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں گے جیسے کہ پوجاپاٹ میں کھڑے ہوتے ہیں اور پھر اس کا نام ''اسلامی پوجاپاٹ'' رکھ دیا جائے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی یہ کہے کہ عیسائیت یا یہودیت میں بہت ساری باتیں اسلام سے مشترک پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا ان میں پائی جانے والی کچھ برائیوں سے اجتناب کرتے ہوئے ان کو بطور نظام حیات اختیار کرنے میں کچھ حرج نہیں اور پھر اس کے لئے وہ ''اسلامی یہودیت'' اور ''اسلامی عیسائیت'' کی اصطلاحات وضع کر لے۔ اسی طرح کوئی اگر ''اسلامی قادیانیت'' کی اصطلاح ایجاد کرے تو کیا کوئی جاہل سے جاہل اور گناہ گار مسلمان بھی ایسی اصطلاحات کو قبول کرنے پر تیار ہو گا؟ اور کیا ایسا کرنے والے کا دین وایمان خطرے میں نہیں پر جائے گا؟

تو پھر آخر وہ کونسی مجبوری یا آفت آن پڑی ہے کہ ریاست کے نظم ونسق چلانے لئے شریعت کی مقرر کردہ "خلافت" کی اصطلاح کو اور اس کے قیام کے لئے بیان کردہ طریقہ کار (جس کی وضاحت ان شاء اللہ تفصیل سے آگے آئے گی) کو چھوڑ کر "اسلامی جمہوریت" جیسی مردود اصطلاحات کا سہارا لیا گیا اور اس جمہوری نظام کے قیام کے طریق کار "انتخابات" کو، اسلامی نظام کے قیام کے لئے واحد راستہ اور سبیل قرار دیا گیا۔

کیا یہ طرزِ عمل علمائے یہود والا نہیں، جس میں وہ ہر باطل چیز کو حلال کرنے کے لئے حق کا سہارا دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی اسی روش پر قرآن کریم نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾(البقرة:42)
"اور مت ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ اور نہ حق کو چھپاؤ جبکہ تم جانتے ہو"۔

جمہوریت سے متعلق عصر حاضر کے چوٹی کے علماء کا موٴقف:

چنانچہ جمہوریت کے کفر و شرک ہونے اور اسلام کے مد مقابل ایک علیحدہ دین ہونے کے حوالے سے ہم عصر حاضر کے چند چوٹی کے علماء کا موٴقف بھی پیش کر دیتے ہیں جس سے اندازہ ہو جائے کہ جتنی بھی جمہوری اصطلاحات ہیں، ان کی اسلامی نظام سیاست میں کسی بھی صورت کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ہم کسی دوسرے سیاسی نظام کو اسلامی لبادہ اڑھانے کے لئے اس کا تقابل اسلامی نظام سیاست سے کریں۔

مشہور سلفی عالم دین مولانا عبد الرحمان کیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مغربی جمہوریت میں پانچ ارکان ایسے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں:
۱۔ خواتین سمیت تمام بالغوں کا حق رائے دہی (بالفاظ دیگر: سیاسی اور جنسی مساوات)
۲۔ ہر ایک کے ووٹ کی یکساں قیمت

۳۔ درخواست برائے نمائندگی اور اس کے جملہ لوازمات

۴۔ سیاسی پارٹیوں کا وجود

۵۔ کثرتِ رائے سے فیصلہ

ان ارکانِ خمسہ میں سے ایک رکن بھی حذف کر دیا جائے تو جمہوریت کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی ہے۔ جبکہ اسلامی نظام خلافت میں ان ارکان میں سے کسی ''ایک'' کو بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ یعنی نہ تو جمہوریت کو ''مشرف بہ اسلام'' کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نظام خلافت میں جمہوریت کے مروجہ اصول شامل کر کے اس کے سادہ، فطری اور آسان طریق کار کو خوہ مخواہ ''مکدر اور مبہم'' بنایا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جمہوریت ایک لادینی نظام ہے اور اس کے علمبردار مذہب سے بیزار تھے۔ جبکہ خلافت کی بنیاد ہی اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کے تصور پر ہے اور اس کے اپنانے والے انتہائی متقی اور بلند اخلاق تھے۔ ہمارے خیال میں جیسے دن اور رات یا اندھیرے اور روشنی میں سمجھوتہ ناممکن ہے، بالکل ایسے ہی دین اور لادینی یا خلافت یا جمہوریت میں بھی مفاہمت کی بات ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر جمہوریت (یا اس کے اصولوں) کو بہر حال اختیار کرنا ہے تو اسے توحید و رسالت سے انکار کے بعد ہی اپنایا جاسکتا ہے''۔ (خلافت و جمہوریت، ص:216۔218)

داعیٔ ختم نبوت مولانا یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض غلط نظریات قبولیتِ عامہ کی ایسی سند حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء (اور عالم کہلانے والے بھی) اس قبولیتِ عامہ کے آگے سر ڈال دیتے ہیں، وہ یا تو ان غلطیوں کا ادراک ہی نہیں کر پاتے یا اگر ان کو غلطی کا احساس ہو بھی جائے تو اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دنیا میں جو بڑی بڑی غلطیاں رائج ہیں، ان کے بارے میں اہل عقل اسی لئے المیے کا شکار ہیں! اسی غلط قبولیتِ عامہ کا سکہ آج ''جمہوریت'' میں چل رہا ہے ۔ جمہوریت دورِ جدید کا وہ ''صنمِ اکبر'' ہے جس کی پرستش اول اول داعیانِ مغرب نے

شروع کی۔ چونکہ وہ آسمانی ہدایت سے محروم تھے، اس لئے ان کی عقلِ نارسا نے دیگر نظام ہائے حکومت کے مقابلے میں جمہوریت کا بت تراش لیا اور پھر اس کو مثالی طرزِ حکومت قرار دے کر اس کا صور بلند آہنگی سے پھونکا کہ پوری دنیا میں اس کا غلغلہ بلند ہوا، یہاں تک کہ مسلمانوں نے بھی تقلیدِ مغرب میں جمہوریت کی مالا جپنی شروع کر دی۔ کبھی یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ "اسلام جمہوریت کا علم بردار ہے" اور کبھی "اسلامی جمہوریت" (جیسی خبیث اصطلاح) وضع کی گئی۔ حالانکہ مغرب "جمہوریت" کے جس بت کا بچاری ہے، اس کا نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلّق نہیں بلکہ وہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی ضد ہے۔ اس لئے اسلام کے ساتھ جمہوریت (یا اس کی اصطلاحات) کا پیوند لگانا اور جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنا صریحاً غلط ہے"۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل، جلد 8، ص:176)

شیخ امین اللہ پشاوری حفظہ اللہ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

"جمہوری انتخابات اور حکومت و عہدے کی طلب بھی بہت بڑا فتنہ ہے اور اللہ کی قسم! یہ عظیم فتنہ "کفر باللہ اور کفر بالاسلام" پر مشتمل ہے اور اپنے اندر تمام کبائر اور گناہوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جو شخص اس بات کو نہیں سمجھتا اسے چاہیے کہ موجودہ دل کی جگہ دوسرا دل، موجودہ عقل کی بجائے دوسری عقل اور موجودہ ایمان کے بدلے اور ایمان اللہ سے مانگے"۔ (الفوائد، انتخابات کا فتنہ، ص43)

ابو محمد عاصم المقدسی حفظہ اللہ اپنی مشہور معروف کتاب "الدیمقراطیہ دین" میں فرماتے ہیں:

"جمہوریت لادینیت یا سیکولرازم کی "ناجائز اور غیر قانونی باندی" ہے اور سیکولرازم ایسا "کفری دین" ہے جو زندگی اور ریاست و حکومت سے دین کو نکال باہر کرتا ہے۔ جمہوریت دراصل عوام یا طاغوت کے فیصلے کو کہتے ہیں اور یہ کسی بھی حال میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت میں اللہ کے قانونِ محکم کا بالکل اعتبار نہیں، سوائے یہ کہ اللہ

کا قانون پہلے دستور کے مطابق ہو جائے یا پھر عوامی خواہشات کے اور ان سب سے پہلے وہ "طاغوت" یا "سربراہ طبقے" کی ترجیحات واغراض کے عین مطابق ہو جائے........ باالفاظِ دیگر یہ جمہوری آزادی ہی تو ہے جو اللہ کے دین اوراس کے قانون اور اس کے حدود کی تمام حد بندیوں سے مکمل آزاد کر دیتی ہے۔ کیونکہ زمینی دستور کا قانون اور وضعی قانون کی حدودیں، اس گندی جمہوریت میں مکمل محفوظ ومامون بھی ہیں اور نافذ العمل بھی ہیں بلکہ جو ان کی خلاف ورزی یا مخالفت کرے اس کے لئے سزا ضروری ہے۔

لہٰذا اے میرے موحد بھائیو! جمہوریت اللہ کے دین کے مدمقابل ایک مستقل دین ہے۔ جس میں طاغوت کی حکمرانی ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی، جھوٹے معبودان متفرقہ کی شریعت ہے نہ کہ اللہ واحد وقہار کی........ (لہٰذا) کسی شخص کا دین جمہوریت کے مطابق ان میں حصہ لینا یا حصہ لینے والوں کی موافقت کرنا اور اپنے لئے قانون سازی کو قبول کرنا اور اپنے بنائے ہوئے قانون کو اللہ کی کتاب و قانون پر مقدم کئے جانے کو قبول کر لینا ہی "عین کفر" ہے اور واضح گمراہی ہے بلکہ معبود حقیقی سے ٹکر لے کر اس کے ساتھ شرک کرنا ہے"۔ (الديمقراطية دين، فصل اول)

مشہور محدث ومفسر علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے ﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ "اور ان کا معاملہ باہم مشورے سے طے ہوتا ہے" اس جیسی آیات کے ذریعے اپنی گندی جمہوریت کو جائز قرار دینے والوں کی بڑی مؤثر تردید کی ہے چنانچہ آیات: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ (آل عمران:159) "اور معاملے میں ان سے مشورہ لو" ﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ:38) "اور ان کا معاملہ باہم مشورے سے طے ہوتا ہے" کی تفسیر کے حاشیے میں فرماتے ہیں:

"عصر حاضر میں دین کو مذاق بنالینے والے علماء وغیرہ ان دونوں آیات کو اپنی باطل تاویل اور گمراہ کرنے کے لئے مشقِ ستم بناتے ہیں تاکہ فرنگی کے بنائے ہوئے دستوری نظام کو جائز قرار دیں جس کا نام انہوں نے "جمہوری نظام" رکھ کر عوام کو دھوکے میں ڈال رکھا

ہے یہ لوگ ان دونوں آیات کو سرورق اور ہیڈنگ بناتے ہیں تا کہ اسلام سے منسوب جماعتوں کو دھوکہ دے سکیں۔ درحقیقت یہ ایسا کلمہ حق ہے جس سے باطل مقصد پورا کیا جارہا ہے........(آگے فرماتے ہیں) نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''عقلمند اور سمجھ دار مجھ سے قریب رہا کریں''۔ان سے بے دین اور اللہ کے دین سے مصروف جنگ یا اعلانیہ گناہ کرنے والے یا خود کو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے مخالف قوانین بنانے کا مستحق سمجھنے والے اور اللہ کے دین کو برباد کرنے والے لوگ مراد نہیں جو کفر اور فسق کے مابین ہوں۔ ان کا صحیح مقام یہ نہیں کہ مشیر کے مرتبے پر فائز کئے جائیں بلکہ ان کے لئے تختہ دار یا کوڑا ہے''۔(عمدۃ التفسیر:3/64-65)

کیا جمہوریت کو حکمت و مصلحت کے نام پر اختیار کیا جاسکتا ہے؟

آخری جملہ معترضہ اگر کوئی رہ جاتا ہے تو وہ یہ کہ ہم انتہائی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں جمہوری نظام کو اختیار کر رہے ہیں کیونکہ فی الوقت پوری دنیا میں حکومت حاصل کرنے کا ایک یہی طریقہ رائج بھی ہے اور مقبول بھی، اور یہ کہ ابھی حالات موافق نہیں ہوئے کہ جمہوری نظام کے علاوہ کسی اور طریقے سے حکومت حاصل کی جائے لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ اسی طریق کار کو اختیار کیا جائے۔

بہتر یہ ہو گا کہ اس کا جواب ہم اگر خود سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریر ہی سے دے دیں جو کہ انہوں نے ایسی ہی باتیں کرنے والوں کے رد میں لکھی تھی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کہتے ہیں:

''اس قسم کے معاملات میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ نظام مسلط ہو چکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں، اس لئے اگر ہم ''انتخابات'' میں حصہ نہ لیں اور نظام حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات پہنچ جائیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو جو اصولاً حرام ہو، حلال ثابت نہیں کیا جاسکتا

،ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو "مصلحتوں اور ضرورتوں" کی بناء پر حلال نہ ٹھہرالیا جائے۔ اضطرار کی بناء پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے "فرائض" کی ادائیگی میں کوتاہی کرکے اضطرار کی حالتیں پیدا کریں، پھر اس اضطرار کو دلیل بناکر تمام محرمات کو اپنے لئے حلال کرتے جائیں اور اس اضطرار کی حالت کو ختم کرنے کے لئے کوئی کوشش نہ کریں۔ جو (جمہوری) نظام اس وقت مسلمانوں پر مسلط ہوا ہے، جس کے تسلط کو وہ اپنے لئے دلیلِ اضطرار بنارہے ہیں، وہ آخر ان کی اپنی ہی غفلتوں کا تو نتیجہ ہے۔ پھر اب بجائے اس کے کہ اپنا سرمایۂ قوت وعمل اس نظام کو بدلنے اور "خالص اسلامی نظام" قائم کرنے کی سعی میں صرف کریں، وہ اس اضطرار کو حجت بناکر اسی نظام (جمہوریت) کے اندر حصہ دار بننے اور پھلنے پھولنے کی کوشش کررہے ہیں"۔ (ترجمان القرآن۔ محرم 65ھ۔ دسمبر 1945ء)

افسوس در افسوس! کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی یہ کہنے سے پہلے کہ:

.........جماعت اسلامی اپنے دستور کی رو سے اپنے پیش نظر اصلاح وانقلاب کے لئے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے۔

اور یہ کہ:

.........آئینی وجمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلی قیادت کے لئے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لئے جائز نہیں ہے۔

درج بالا تحریر کو سامنے رکھ لیتے تو آج تک جماعت کی ساری دوڑ دھوپ لاحاصل مقاصد پر نہ لگتی کہ جس کا نہ دنیا میں کوئی اچھا نتیجہ نکلا اور نہ ہی آخرت میں اس پر کوئی اجر وثواب ملنی کی امید کی جاسکتی

ہے بلکہ اُلٹا خسران کا اندیشہ موجود ہے۔ چنانچہ آج اس قوم کی خوش قسمتی ہوگی کہ اگر جماعت کے اراکین سے لے کر عام کارکنان تک اس تلخ حقیقت کو جان کر اس سے اجتناب کرلیں۔

اپنے ہی وضع کردہ اصولوں سے واضح انحراف:

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جانب سے جمہوری نظام کو مباحات کے دائرے میں لانے کے باوجود اس کو اختیار کرنے کے حوالے سے جماعت کے لئے چند اصول مقرر کئے تھے۔ وہ درج ذیل ہیں:

''الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لئے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کا نظام چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عامہ کو اس حد تک اپنے عقیدے و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستورِ حکومت تبدیل کرسکیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہوسکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ (انتخابات کا) طریق کار ہم صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ؛

اوّلاً؛ ملک میں ایسے حالات پیدا ہوچکے ہوں کہ محض رائے عامہ کا کسی نظام کے لئے ہموار ہوجانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لئے کافی ہوسکتا ہو۔

ثانیاً؛ ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگانِ ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضہ پیدا ہوچکا ہو۔

ثالثاً؛ انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہو بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے''۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر 1945ء)

چنانچہ اس ضمن میں ہم اوّلاً پہلے دو اصولوں کا مختصر تجزیہ کریں گے اور اس حوالے سے جماعت کا طرز عمل بھی جانیں گے۔

.........پہلے اصول میں دو باتوں کی نشاندہی کی گئی؛ پہلی یہ کہ جمہوری عمل میں شرکت سے پہلے اسلامی نظام کے لئے رائے عامہ کا ہموار ہو جانا اور دوسرا یہ کہ رائے عامہ کا ہموار ہونا بھی کسی نظام کے قیام کے لئے کافی ہو سکتا ہو۔

.........دوسرا یہ اصول طے ہوا کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے ملک کی بہت بڑی اکثریت کو ہم خیال بنایا جا چکا ہو اور یہ بھی کہ اسلامی نظام کے قیام کا عام تقاضہ پیدا ہو چکا ہو۔

اب ان وضع کردہ اصولوں کو سامنے رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ:

.... کیا پاکستان کی رائے عامہ شریعت کے نفاذ کے لئے ہموار ہو چکی ہے؟

.........کیا اگر پاکستان میں رائے عامہ کا اس حوالے سے ہموار ہونا ایک لادین حکومتی و عدالتی نظام اور اس کی محافظ فوج کی موجودگی میں اسلامی نظام کے قیام لئے کافی ہو جائے گا؟

.........کیا پاکستان کی عوام الناس کی اکثریت کو دعوت و تبلیغ کے ذریعے اسلامی نظام کے قیام کی حمایت کے لئے اپنا ہم خیال بنایا جا چکا ہے؟

.........کیا اسلامی نظام کے قیام کے حوالے سے ملک میں عام تقاضہ اور مطالبہ پیدا ہو چکا ہے؟

جو بھی پاکستان کے دینی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات سے واقفیت رکھتا ہے وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان تمام اصولوں کے مطابق اب تک پاکستان کے حالات موافق ہو ہی نہیں سکے۔ جہاں تک رائے عامہ کے ہموار ہونے کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ اسلامی نظام کے قیام کے حوالے

سے ملک میں کی جانے والی مختلف اوقات میں مختلف کوششوں، خاص کر گزشتہ سالوں میں لال مسجد وجامعہ حفصہ اوراہلیان سوات کی کوششوں پر رد عمل سے کیاجاسکتاہے!

پھر اس پر مزید یہ کہ اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں سے متعلق رائے عامہ کے تھوڑے بہت ہموار ہونے کے باوجود جو رد عمل لادین حکومتی و عدالتی نظام اور اس کی محافظ فوج کی طرف سے آیا ہے، اس کے آگے اس رائے عامہ کی کوئی حیثیت نہیں........اور دعوت و تبلیغ آج تک اس انداز میں دی ہی نہیں جاسکی جس کی وجہ سے عوام الناس کی اکثریت کو اسلامی نظام کے قیام کی حمایت کے لئے اپناہم خیال بنایاجاسکے جس کی وجہ سے ملک میں شریعت کے نفاذ کا تقاضہ و مطالبہ زور پکڑ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوری عمل میں جماعت کی شرکت سے متعلق اپنے ہی وضع کردہ اصولوں (کو جن کی حقیقت میں کوئی اصل نہیں تھی ان) کا پاس نہ ہی جماعت کے امیر و بانی نے کیااور نہ ہی آج تک جماعت ان اصولوں پر کاربند ہوسکی بلکہ اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کی خود ہی جس طرح دھجیاں بکھیری گئیں، اس کی شاید ہی کوئی مثال کسی منظم اور اصولی جماعت کی تاریخ میں ملتی ہو۔

یہ ہیں وہ تضادات جو کہ جماعت کے مقصدِ قیام اور اس کے طریق کار کے بیان میں، جماعت کے دستور اور اس کے بانی کے افکار و نظریات اور طریق کار میں پائے جاتے ہیں۔

کیاپاکستان کا دستور اسلامی ہے؟

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی جماعت کی جانب سے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے جو شرط بیان کی کہ:

> ....الیکشن لڑنااور اسمبلی میں جانااگر اس غرض کے لئے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کا نظام چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔

اور یہ کہ:

.........انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہو بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

تو اس ضمن میں یہ جان لیتے ہیں آیا واقعتاً پاکستان کا آئین ''اسلامی'' ہے، جس کی بنیاد پر جماعت گزشتہ ساٹھ پچاس برس سے الیکشن میں حصہ لے رہی ہے۔

اس پہلے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ کیا پاکستان کا آئین ''اسلامی'' ہے، ہم اس بات کو جان لیتے ہیں کہ کیا کتاب وسنت کے بعد کسی اور دستور کی شرعی طور پر گنجائش بھی موجود ہے یا نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ''دین اسلام'' کے قانون شریعت کے تکمیل کے بعد کسی نئے ''آئین ودستور'' کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس کے عملی نفاذ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن پھر بھی اس کے عملی نفاذ کے بجائے یہ تسلیم کرلینا بہت بڑی گمراہی اور صریح کفر ہے کہ شریعت کا نفاذ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک ''آئین ودستور'' نامی انسانی دستاویز میں اس بات کو لکھ نہیں دیا جائے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہوگی اور صرف قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی کی جائے گی۔

گویا کہ اللہ کی نازل کردہ شریعت، اپنے عملی نفاذ کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ پہلے ایک ''آئین ودستور'' نامی انسانی دستاویز وضع کی جائے پھر اس کے بعد وہ اپنے عملی نفاذ میں اس کی بھی محتاج ہے کہ اس دستور میں باقاعدہ واضح طور پر لکھا جائے کہ ملک کا قانون قرآن وسنت کے مطابق ہوگا ،ورنہ بصورت دیگر اس کا عملی نفاذ ممکن ہی نہیں۔

واللہ! اللہ رب العزت نے اپنی شریعت مطہرہ کو نازل کرنے کے بعد کہیں یہ شرط نازل نہیں کی کہ اس کے عملی نفاذ سے پہلے اس کے لئے ایک ''آئین ودستور'' بناؤ اور اس بات کو اس میں واضح طور پر لکھو، اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے

ایسی کسی شرط کو بیان کیا اور نہ ہی بعد میں امت مسلمہ کو کبھی شریعت کے عملی نفاذ کرنے کے لئے اس قسم کے کام کی کوئی حاجت محسوس ہوئی۔

اس کے باوجود بھی اگر کوئی اس خذلان میں مبتلا رہنے پر بضد ہے کہ پاکستان کا آئین و دستور ''اسلامی'' ہے اور اس کے ذریعے اسلامی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔ انشاء اللہ! ہم اس خذلان کو بھی مختصراً دور کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ اس حوالے کوئی قیل و قال باقی نہ رہے۔

سب سے پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ دستورِ پاکستان کے مطابق کسی بھی اہم امور سے متعلق قانون (چاہے وہ شریعت سے لیا گیا ہو یا کہیں اور سے) اس وقت تک قابل عمل اور ملکی قانون کا حصہ نہ بن سکتا جب تک پارلیمنٹ کی ''دو تہائی اکثریت'' اس کو منظور نہ کرلے، تو کیا ایسی کسی بھی شرط کے ساتھ واضح شرعی نصوص سے ثابت ''شرعی قوانین'' کو باندھنا شرعی طور پر جائز ہوگا؟ کیا یہ پرلے درجے کی گمراہی قبیح قسم کا کفر نہیں ہوگا؟

پھر دوسرا سوال دستورِ پاکستان کو اسلامی آئین قرار دینے والوں سے یہ سوال ہے کہ ذرا انسانی ہاتھ کے وضع کردہ اس آئین کو پڑھ کر یہ بتلادیں کہ شریعت کی مقرر کردہ وہ کون سی ایک ''حَد'' ہے جس کو اس دستور میں بغیر کسی کانٹ چھانٹ اور ترمیم و تحریف کے لکھ دیا گیا ہو۔ قصاص کے معاملے میں شریعت کی واضح نصوص سے ثابت سزائے موت سے لے کر چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا تک، زناء کاری کی سزا سے لے کر شراب نوشی و شراب فروشی کی سزا تک وہ کونسی حد ہے جو ہو بہو نافذ کردی گئی ہو یا اس کو بغیر کسی ترمیم و تحریف کے دستور میں تسلیم کرلیا گیا ہو۔

کیا اللہ کی نازل کردہ شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں کے بارے میں کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس میں کسی قسم کی کمی و زیادتی کرسکے اور جو کوئی ایسا فعل انجام دے تو اس کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ سید ابو الاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

((يؤتى بوال نقص من الحد سوطاً،فيقال له لم فعلت ذاك؟ فيقول رحمة لعبادك، فيقال له أنت أرحم بهم مني! فيؤمر به الى النار، ويؤتى بمن زاد سوطاً فيقال له لم فعلت ذلك؟ فيقول لينتهوا عن معاصيك،فيقول أنت أحكم به مني!فيؤمر به الى النار))

''قیامت کے روز ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حد میں سے ایک کوڑا کم کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا یہ حرکت تونے کیوں کی تھی؟وہ عرض کرے گا آپ کے بندوں پر رحم کھاکر ۔ارشاد ہو گا کہ کہ اچھا!تو ان کے حق میں مجھ سے زیادہ رحیم تھا!پھر حکم ہو گا کہ لے جاؤاسے دوزخ میں۔ ایک اور حاکم لایا جائے گا جس نے حد پر ایک کوڑے کا اضافہ کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ کس لئے کیا تھا؟وہ عرض کرے گا تاکہ لوگ آپ کی نافرمانیوں سے باز رہیں۔ ارشاد ہو گا کہ تو ان کے معاملے میں مجھ سے زیادہ حکیم تھا!پھر حکم ہو گا لے جاؤاسے دوزخ میں''۔(تفیسرالرازی ج11ص239۔الکشاف ج4 ص375۔بحوالہ تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ 344)

ان تمام حقائق کے باوجود ایسا آئین جس کے بس ماتھے پر یہ لکھ دیا گیاہو کہ یہ ''اسلامی'' ہے مگر شریعت کی مقرر کردہ حدود سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے معاشی و معاشرتی قوانین تک، کسی کو بغیر کسی ترمیم و تحریف کے تسلیم اور نافذ کیا گیاہو ،توکیا اس آئین کو تسلیم کرنے کی کوئی شرعی حیثیت باقی رہ جاتی ہے ؟اور پھر یہ کہ کیا دستورِ پاکستان میں وہ قوانین بھی شامل نہیں ہیں جو کہ شریعت کے بنیادی نصوص سے بالکل متصادم ہیں اور وہ انگریز کے بنائے قوانین سے مستعار لئے گئے ہیں اور اگر ان کو فی الواقع تسلیم کر لیا جائے تو وہ اسلام کی بنیادیں گرادینے کے لئے کافی ہیں۔(اس ضمن میں دستورِ پاکستان سے متعلق ڈاکٹر ایمن الظواہری حفظہ اللہ کی معرکۃ الآراء کتاب الصبح والقندیل کا اردو ترجمہ ''سپیدۂ سحر اور ٹمٹماتا چراغ''کا مطالعہ مفید رہے گا)

چنگیز خان کا وضع کردہ دستور ''یاسق'':

کیا ایسے آئین و دستور کی مثال چنگیز خان کے وضع کردہ دستور ''یاسق'' کی مانند نہیں ہے جس کو چنگیز خان نے بطور ایک دستور کے تصنیف کیا تھا اور اس میں یہودیت، نصرانیت اور اپنی خواہشات پر مبنی قوانین وضع کئے تھے اور ساتھ میں کچھ اسلامی قوانین کی جھلک ترمیم و تحریف کے ساتھ رکھ دی تھی اور بعد میں اس کی اولاد اسلام قبول کرنے کے باوجود اس کو بطور ملک کے ''آئین و دستور'' کے نافذ کیا تھا۔ جیسا کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''چنگیز خان نے تاتاریوں کے لئے ''یاسق'' وضع کیا تھا۔ یاسق اس ''مجموعہ قوانین'' کا نام ہے جو چنگیز خان نے مختلف مذاہب، یہودیت، نصرانیت اور اسلام وغیرہ سے لے کر مرتب کیا تھا۔ اس میں بہت سے ایسے احکام بھی تھے جو کسی مذہب سے ماخوذ نہیں تھے وہ محض چنگیز خان کی خواہشات اور اس کی صوابدید پر مبنی تھے۔ یہ کتاب بعد میں قابل اتباع قرار پائی اور وہ اس کتاب کو اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر بھی مقدم رکھتے تھے۔ ان میں سے جس جس نے بھی ایسا کیا ہے وہ کافر ہے، واجب القتل ہے جب تک کہ (وہ ایسے مجموعہ قوانین سے) توبہ کرکے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی طرف نہ آئے اور ہر قسم کا چھوٹا بڑا فیصلہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہ کرے۔'' (تفسیر ابنِ کثیر رحمہ اللہ ج:2ص:68)

شیخ حامد الفقی رحمہ اللہ، ابن کثیر رحمہ اللہ کے درج بالا اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے دور حاضر کے رائج ''آئین و دستور'' کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ان تاتاریوں کی طرح بلکہ ان سے بھی بدتر وہ لوگ ہیں جو انگریزوں کے قوانین اپناتے ہیں اور اپنے مالی، فوجداری اور عائلی معاملات کے فیصلے ان کے مطابق کرتے ہیں اور ان انگریزی قوانین کو اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر مقدم رکھتے

ہیں۔ ایسے لوگ بغیر کسی شک و شبہ کے ''مرتد اور کافر'' ہیں اور جب تک وہ اس روش پر قائم رہیں اور اللہ کے حکم کی طرف رجوع نہیں کریں تو وہ اپنا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیں، انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور وہ اسلام کے ظاہری اعمال میں سے جتنے چاہیں عمل کرلیں، وہ سب کے سب بیکار ہیں جیسے نماز، روزہ اور حج و عمرہ وغیرہ''۔(فتح المجید:838)

آج شریعت کے عملی نفاذ کو آئین و دستور کے ساتھ مشروط کرنا مسلمانوں پر مسلط کلمہ گو طواغیت کا رچایا ہوا ڈرامہ ہے جس کے ذریعے وہ ہر مسلمان، چاہے وہ عالم ہو یا جاہل، اس کی ساری سعی و جدوجہد کو شریعت کے عملی نفاذ سے ہٹاکر آئین و دستور کی تدوین اور اس کو اسلامی بنانے میں ہی برباد کروانا چاہتے ہیں اور خود وہ بغیر کسی مزاحمت و مخالفت کے، اپنی خواہشات نفسانی پر مبنی یا اپنے بیرونی آقاؤں کے وضع کردہ آئین و دستور سے مستعار لئے ہوئے قوانین کو ملکی آئین و دستور میں شامل کرنے کے باوجود ''خلیفۃ المسلمین'' کے عہدے پر فائز رہیں اور ان سے بغاوت کرنے والا ان ہی کے وضع کردہ آئین و دستور کے مطابق باغی، مجرم اور قابل گردن زنی قرار پائیں۔

وضعی آئین و دستور کے بارے میں علمائے حق کا فیصلہ:

درحقیقت شریعت کے نفاذ کو آئین و دستور کی منظوری سے مشروط کرنے کے حوالے سے عصر حاضر اکثر اہل علم دھوکہ کھاگئے۔ جن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی شامل ہیں۔ مگر کچھ اہل و عمل ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس مکر وفریب کا پردہ چاک کیا اور حقیقت عوام الناس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

سعودی عرب کے سابق مفتی عام اور کبار علماء میں سے ایک شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کو جو کہ دراصل شیطان کے نازل کردہ ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ قوانین پر ترجیح دینا یا اس کے ہم پلہ سمجھنا واضح، صریح اور بڑا کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قوانین نازل ہی اس لئے کئے تھے کہ سارے جہاں میں انہیں نافذ کر دیں، تمام متنازعہ اُمور کے فیصلے اس دین کے ذریعہ سے ہوں"۔(رسالۃ تحکیم القوانین)

علامہ شنقیطی رحمہ اللہ سورۃ الکہف کی آیت

﴿لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾(سورۃالکھف:26)
"اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اللہ کے حکم میں کسی بھی قسم کے احکام کی آمیزش نہ کرے، حکم صرف اور صرف اللہ ہی کا "تسلیم "کرے۔ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو بھی حکم، جو فیصلہ اللہ نے کر دیا ہے اسے بغیر کسی ملاوٹ کے "تسلیم" کرنا ہے۔ اللہ کے فیصلوں میں سب سے پہلا فیصلہ ہے اس کے بنائے اور نازل کئے ہوئے قوانین کے مقابلے میں جو لوگ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اتباع کرتے ہیں، جو کہ دراصل شیطانی قوانین ہیں جو اس نے اپنے متبعین کے ذریعہ بنوائے ہیں، یہ سراسر اللہ کی شریعت کے خلاف ہیں اور ان کی تابعداری کرنے والے بلا شک و شبہ کافر ہیں، اللہ نے ان کی بصارت و بصیرت (دونوں) چھین لی ہے۔ یہ لوگ وحی الٰہی کے نور سے مکمل طور پر محروم ہیں"۔(اضواء البیان 4/82۔83)

داعیٔ ختم نبوت مولانا یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"خلافت میں حکمران کے لئے بالاتر قانون "قرآن وسنت" ہے،اور اگر مسلمانوں کا اپنے حکام کے ساتھ نزاع ہو جائے تو اس کو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا

اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا جائے گا، جس کی پابندی راعی و رعایا دونوں پر لازم ہو گی۔ جبکہ جمہوریت کا فتویٰ یہ ہے کہ مملکت کا "آئین" سب سے مقدس دستاویز ہے اور تمام نزاعی امور میں "آئین و دستور" کی طرف رجوع لازم ہے، حتیٰ کہ عدالتیں بھی آئین کے خلاف فیصلہ صادر نہیں کر سکتیں۔ لیکن (حال یہ ہے کہ) ملک کا دستور اپنے تمام تر تقدس کے باوجود عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ وہ مطلوبہ اکثریت کے بل بوتے پر اس میں جو چاہیں ترمیم و تنسیخ کرتے پھریں، کوئی ان کو روکنے والا نہیں اور مملکت کے شہریوں کے لئے جو قانون چاہیں بنا ڈالیں، کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں"۔(آپ کے مسائل اور ان کا حل، جلد 8، ص:176)

مالاکنڈ ڈویژن کے مشہور عالم ربانی مولانا ولی اللہ کابل گرامی شہید رحمہ اللہ پاکستان کے کفری دستور کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وهم يدعون أنها دولة اسلامية، بل هي حصن الاسلام۔ وأما في نفس الأمر، فلست دولة باكستان دولة اسلامية، ولادار اسلام لأن دستورها دستور كفري، وبالصلوة والصيام واقامة الجمعة والأعياد لا تكون اسلامية، والا فتكون دول أوروبا وأمريكا وغيرها دولة اسلامية بعين هذا الدليل﴿هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ﴾(آل عمران:167)"۔(اعلام الأعلام بمفهوم الدين والاسلام أورفع الحجاب عن مضار الجمهورية والانتخاب، ص:333 تا 334)

" وہ (لوگ جو) بالعموم دعویٰ کرتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست بلکہ "اسلام کا قلعہ" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارباب حکومت کچھ بھی کہیں، نہ تو پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، نہ ہی یہ کسی طرح "دارالاسلام" کہلا سکتا ہے، کیونکہ اس کا دستور ایک "کفری

دستور'' ہے۔ محض نماز، روزے اور جمعہ وعیدین کی ادائیگی سے کوئی خطہ دار الاسلام نہیں بن جاتا، وگرنہ تو عین اسی دلیل کی بناء پر یورپ اور امریکا کے بھی بہت سے علاقے دارالاسلام قرار پائیں گے۔ (ایسی دلیلیں دینے والوں کے بارے میں قرآنی حکم یہ ہے کہ)''یہ اُس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہیں اور جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اللہ اس سے خوب واقف ہے''۔

علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان الأمر فی هذه القوانين الوضعية واضح وضوح الشمس، هي كُفرٌ بواح، لاخفاء فيه ولامداورة، ولاعذر لأحد ممن ينتسب لاسلام ـ كائناً من كان ـ فی العمل بها، أو الخضوع لها أو اقرارها، فليحذر امرؤ لنفسه، وكل امرئٍ حسيبُ نفسه، ألا فليصدع العلماء بالحق غير هيابين وليبلغوا ماأمروا بتبليغه غير موانين ولا مقصرين''۔ (عمدة التفسير، ج:4ص:174)

''یقیناان ''وضعی قوانین'' کا معاملہ اظہر من الشمس ہے۔ ان قوانین کا کفریہ ہونا اتنا واضح اور بیّن امر ہے جس میں کسی شک وتردد کی کوئی گنجائش نہیں۔ پس اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے والے کسی بھی شخص کے لئے........خواہ وہ کوئی بھی ہو........ان قوانین پر عمل کرنے، ان کے سامنے سرِ ''تسلیم'' خم کرنے یا انہیں ماننے کا کوئی جواز نہیں۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اس فتنے سے بچنے کی فکر کرے اور ہر شخص خود ہی اپنا محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ بالخصوص علمائے حق کی یہ ذمہ داری ہے کہ آج وہ ہر خوف اور خطرے سے بے پرواہ ہو کر حق بات اعلانیہ کہہ ڈالیں اور کسی تاخیر وتقصیر کے بغیر اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچائیں''۔

واللہ! ان تمام دلائل وبرہان کے بعد ہم پر لازم ہے کہ ہم شریعت کے عملی نفاذ کو انسانوں کے بنائے ہوئے آئین ودستور کی زنجیروں میں جکڑنے سے اللہ کی پناہ میں آجائیں اور ہر ایسے آئین

ودستور کو، جس کے ذریعے ایسا کرنے کی کوشش کی جائے، اُس کو قابل عمل سمجھنے کے بجائے جلا کر
سمندر برد کردینے کو اپنا دینی فریضہ سمجھیں۔

تنظیم اسلامی کے فکر و منہج کا تجزیہ

تنظیم اسلامی کے قیام کا مقصد:

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ کسی بھی جماعت کے نصب العین کا تعین اس کے قیام کے مقصد اور طریقہ کار سے ہوتا ہے، تو تنظیم اسلامی کے مقصدِ قیام اس کے طے کردہ منشور میں دفعہ 1: میں مقصد، نصب العین اور تنظیمی اساس کے تحت اس طرح لکھا ہے:

''تنظیم اسلامی نہ معروف معنی میں سیاسی جماعت ہے، نہ مذہبی فرقہ، بلکہ اصولی، اسلامی، انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے ،یعنی اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام، بالفاظ دیگر ''اسلامی انقلاب'' اور اس کے نتیجے میں ''نظام خلافت علیٰ منہاج النّبوت'' کے قیام کے لئے کوشاں ہے''۔(دستور تنظیم اسلامی، ترمیم شدہ جون 2009ء ص 3)

گویا مختصر الفاظ میں تنظیم اسلامی اس مقصد کے لئے قائم ہوئی کہ پاکستان سمیت دنیا بھر ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کا نظام قائم ہو جائے۔

مقصدِ قیام کے حصول کے لئے طریقہ کار کا تعین:

5 تا 11 اگست 1977ء قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہونے والے اجتماع میں، دستوری طور پر تنظیم اسلامی کے طریق کار سے متعلق یہ بات طے کی گئی کہ:

''تنظیم اسلامی کا یہ اجتماع عام حسب دفعہ 3 دستور تنظیم اسلامی طے کرتا ہے کہ:

ا۔ آئندہ تنظیم اسلامی کا نظام مغرب سے درآمد شدہ قانونی اور جمہوری اصولوں کے بجائے قرآن و سنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہو گا"۔(تعارف تنظیم اسلامی، ص19)

اسی طرح تنظیم اسلامی کے طریق کار سے متعلق تنظیم کے دستور میں لکھا ہے:

"(تنظیم کے) طریق کار کے حوالے سے کتاب "منہج انقلاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم" کو بھی تنظیم کے اساسی فکر کی حیثیت حاصل ہے"۔(دستور تنظیم اسلامی، ترمیم شدہ جون 2009ء ص3)

کتاب "منہج انقلاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم" دراصل تنظیم اسلامی کے بانی اور سابق امیر ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے خطبات پر مشتمل ایک مجموعہ ہے، جس میں انہوں نے فریضۂ اقامت دین کے لئے منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی فکر و نظر کے مطابق بیان کیا اور اسی کو بظاہر اً اپنی تنظیم کا طریق کار قرار دیا۔

تنظیم اسلامی کے طریق کار کا ایک مختصر خلاصہ:

بانیٔ تنظیم اسلامی نے فریضۂ اقامت دین کے لئے اپنی سمجھ کے مطابق بیان کردہ "منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم" کو اپنی تنظیم کا طریق کار قرار دیا تھا اور جس کو مرحلہ وار اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اُس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) فکر کی دعوت دینا
(۲) مقاصد کے حصول کے لئے تنظیم کا قیام
(۳) تربیت / ٹریننگ
(۴) تشدد و تعزیب کے مقابلے میں صبر محض
(۵) اقدام اور چیلنج
(٦) مسلح تصادم (Armed Conflict)

(۷) انقلاب کی توسیع

"دعوت" کے ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں:

"ظاہر ہی بات ہے کہ انقلاب کسی انقلابی نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے۔اس کا نقطۂ آغاز (Starting Point) یہ ہے کہ اس نظریہ کی نشر واشاعت کی جائے، اسے پھیلایا جائے، اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور لوگوں کو اس نظریہ کی افادیت کا دلائل سے قائل کیا جائے"۔(منہج انقلاب نبوی ص15)

اگلے مرحلے میں انقلاب کے لئے کسی "تنظیم" کے قیام کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

"انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ یہ ہو گا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریہ کو ذہناً قبول کر لیں ان کو منظم کیا جائے۔اس طرح انقلابی جماعت وجود میں آجائے گی"۔(منہج انقلاب نبوی ص15)

پھر تیسرے مرحلے یعنی "تربیت" کے ضمن میں کہتے ہیں:

"انقلابی عمل میں تیسرا مرحلہ ٹریننگ یعنی تربیت کا ہے، جو ہر انقلابی عمل کی ایک ناگزیر ضرورت ہے"۔(منہج انقلاب نبوی ص17)

پھر ان تین ابتدائی مرحلوں کے بارے میں کہتے ہیں:

"پس یہ تین ابتدائی مرحلے ہیں۔ان تینوں کا حاصل یہ ہے کہ تربیت یافتہ کارکنوں پر مشتمل ایک انقلابی جماعت وجود میں آجائے جو ایک طاقت اور قوت بن جائے"۔(منہج انقلاب نبوی ص18)

پھر اگلے تین مرحلوں کو "تصادم" کا عنوان دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"انقلابی عمل کے اگلے تین مرحلوں کا جامع عنوان ہے "تصادم"......... یہ بات طے ہے کہ انقلاب تصادم کے بغیر نہیں آتا......... اگر نظام بدلنا مقصود و مطلوب ہو اور پھر تصادم سے بھی گریز ہو تو یہ ممکن نہیں......... تصادم تو انقلاب کے لوازم میں سے ہے"۔(منہج انقلاب نبوی ص18)

پھر تصادم کے آغاز کے سلسلے میں کہتے ہیں:

"یہ ایک بدیہی امر ہے کہ تصادم کا آغاز اصل میں انقلابی جماعت کرتی ہے......... وہ انقلابی جماعت کہتی ہے کہ یہ نظام غلط ہے۔ گویا تصادم کا آغاز اصلاً انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے اس کے تین مدراج (Phases) ہیں"۔(منہج انقلاب نبوی ص18)

پھر تصادم کے ضمن میں پہلے مرحلے "صبر محض" کو یوں بیان کرتے ہیں:

"تصادم کے عمل میں پہلا درجہ Passive Resistance یعنی صبر محض کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انقلابی جماعت اس نظام کو غلط و فاسد قرار دیتی ہے تو لوگ اس جماعت کو آزاد تو نہیں چھوڑیں گے......... استہزا و تمسخر کریں گے......... (پھر) وہ تشدد (Persecution) پر اتر آئیں گے اور عقوبت و ایذا رسانی کی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ یہ معاملہ پیش آنا لازمی ہے۔ لیکن اس دور کے لئے اس انقلابی جماعت کا پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ ماریں کھاؤ، لیکن نہ اپنے موٴقف سے ہٹو اور نہ ہی ہاتھ اٹھاؤ۔ اس لئے اگر اس جماعت نے بھی retaliate کیا یعنی بدلہ میں اس نے بھی ہاتھ اٹھالیا اور وہ جماعت بھی violent ہوگئی تو جما جمایا نظام ہے، اسے اس جماعت کو کچلنے اور نیست و نابود کرنے کا قانونی و اخلاقی جواز مل جائے گا"۔(منہج انقلاب نبوی ص19)

پھر تصادم کے دوسرے مرحلے "اقدام اور چیلنج" کے ضمن میں کہتے ہیں:

''اس کے بعد جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہم کھلم کھلا اور برملا اس غلط نظام کو چیلنج کر سکتے ہیں اور اس نظام کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو اس مرحلہ پر یہ صبر محض(Passive Resistance)اپنے اگلے مرحلے یعنی اقدام (Active Resistance)میں داخل ہو جاتا ہے۔اب حکمت عملی تبدیل ہو گی۔یعنی یہ کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ان کے تشدد کا جواب بھرپور طریقہ پر دو یا اس نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑو''۔(منہج انقلاب نبوی ص20)

پھر آخری مرحلے یعنی تصادم کے تیسرے مرحلے ''مسلح تصادم'' کے ضمن میں کہتے ہیں:

''اس چیلنج کے نتیجہ میں چھٹا اور آخری مرحلہ شروع ہو گا اور وہ ہے مسلّح تصادم۔جب تک وہ انقلابی جماعت اقدام نہیں کر رہی تھی یعنی ماریں کھا رہی تھی اور ہاتھ نہیں اٹھا رہی تھی تب تک اور بات تھی۔اب اگر اس جماعت نے بھی ہاتھ اٹھالیا تو وہ نظام اس پر پوری طاقت اور قوت کے ساتھ حملہ آور ہو گا۔اور یہ ہے وہ آخری مرحلہ (Final Phase)جس کے اندر جسمانی ٹکراؤ(Physical Collisiion)ہو کر رہتا ہے۔اس کے لئے اصطلاح مسلح تصادم یعنی (Armed Conflict)۔ظاہر بات ہے کہ جب یہ چھٹا مرحلہ شروع ہو جائے گا تو اب فریقین کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔اب تو تاریخ بتائے گی، حالات فیصلہ کریں گے اور دو میں سے ایک نتیجہ بہر حال نکلنا ہے اور وہ ہے تخت یا تختہ۔تیسرا کوئی اور راستہ نہیں ہے''۔(منہج انقلاب نبوی ص21)

انقلاب کی کامیابی کی صورت میں ساتواں مرحلے ''انقلاب کی توسیع'' کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

:

''اب اگر انقلاب کامیاب ہو جائے تو ایک ساتواں مرحلہ مزید شروع ہو جائے گا۔ان چھ مراحل سے تو کسی ایک ملک میں انقلاب کی تکمیل ہوتی ہے، جبکہ ساتواں مرحلہ اس انقلاب

کی توسیع کا ہوتا ہے۔اس لئے ایک نظریاتی انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جغرافیائی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔وہ ایک فکر،فلسفہ،ایک نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے اور نظریہ وہ شے ہوتی ہے جس کے لئے نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہے،نہ ویزے کی حاجت۔نظریہ کے لئے سرحدیں رکاوٹ نہیں بنتیں"۔(منہج انقلاب نبوی ص22)

پھران تمام مراحل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"انقلاب کے یہ سات مراحل(3+3 + 1)میں نے سیرت محمدی علیٰ صاحبہاالصلوۃ والسلام سے اخذ کئے ہیں،اس کے سوا میرے نزدیک ان کا کوئی اور مأخذ نہیں ہے،کیونکہ کامل اور ہمہ گیر انقلاب کا منہاج اور نقشہ صرف سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی مل سکتا ہے"۔(منہج انقلاب نبوی ص22)

یہ ہیں وہ مراحل جس کو بانی تنظیم اسلامی،انقلاب یا بالفاظ دیگر شریعت کے نفاذ کے لئے نے اپنی تنظیم کے طریق کار طور پر اختیار کیا ہے۔

اپنے بیان کردہ "منہاج محمدی صلی اللہ وسلم" میں تبدیلی:

بانیٔ تنظیم اسلامی نے اسلامی انقلاب کے لئے منہاج محمدی صلی اللہ وسلم سے اپنی سمجھ کے مطابق ایک طریق کار اخذ کیا اور اس کے مراحل بیان کئے لیکن پھر خود ہی اس میں ترامیم کرتے ہوئے اپنے ہی فہم کے مطابق اس کے آخری مرحلے میں مختلف تبدیلیاں کی،جس کی انہوں نے دو(2)وجوہات بیان کیں جو کہ درج ذیل ہیں:

"ہمارے حالات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سعید کے حالات میں بہرحال چودہ برس سے کچھ زیادہ ہی مدت کا فصل ہے۔اس دوران حالات میں بہت تغیر و تبدل ہوا ہے اور انسان کے تمدنی و عمرانی تصورات میں بہت کچھ ارتقاء ہوا ہے........پھر ایک نمایاں ترین

فرق یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا انقلابی عمل ایک خالص مشرکانہ وکافرماحول میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا جبکہ ہمیں اسلامی انقلاب کے لئے جو کام کرنا ہے وہ مسلمانوں میں کرنا ہے، کافروں میں نہیں۔ لہٰذا ان حالات کی بناء پر ہمیں غور کرنا ہوگا کہ جو طریق کار ہمیں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے آیا بعینہٖ وہی اختیار کرنا لازم ہے یا اس طریق کار میں ہمیں درپیش حالات کے فرق وتفاوت کی وجہ سے کہیں کچھ اجتہاد کرنا ہوگا!''۔(منہج انقلاب نبوی، ص14)

پہلی وجہ ''عمرانی ارتقاء'' کے ضمن میں مزید کہتے ہیں:

''اہم بات یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا جو تمدنی ارتقاء ہوا ہے اس کے اعتبار سے اب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل اور پوری قوت موجود ہوتی ہے، جبکہ عوام اب بالکل نہتے ہوگئے ہیں۔ چنانچہ حکومت اور عوام کے مابین فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ جو مسلح تصادم (Armed Conflict) والا مرحلہ ہے، یعنی پہلے سے قائم شدہ باطل نظام سے مسلح تصادم کا معاملہ وہ نظری اور عملی اعتبارات سے قریباً ناممکن ہوچکا ہے''۔(منہج انقلاب نبوی، ص336)

اور دوسری وجہ کے ضمن میں مزید کہتے ہیں:

''دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور موجودہ حالات میں پہلا واضح ترین اور نمایاں ترین فرق تو یہ واقع ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ایک خالص کافرانہ ومشرکانہ معاشرے میں ہوئی تھی، جبکہ ہمارا تعلق ایک مسلمان معاشرہ سے ہے اور ہمیں اس میں کام کرنا ہے۔ ہمارے ملک ہی کی طرح دوسرے بہت سے ممالک ہیں جن میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد اسی فیصد سے زائد ہے اور ان ممالک کے سربراہ اور حکمران بھی مسلمان ہی ہیں۔ رعایا اور حکمرانوں کے کردار، ان کے اخلاق، ان کی سیرت اور دین سے ان کے

عملی تعلق کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ سب کے سب قانوناً مسلمان ہیں۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم و نافذ نہ ہو بلکہ پورے کا پورا لادینی (Secular) نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران مسلمان ہی تصور کئے جائیں گے"۔(منہج انقلاب نبوی ص336)

اسی طرح ایک اور جگہ وہ اپنے ہی بیان کردہ منہج کے مراحل میں ترمیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"آج وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور حالات میں بہت تبدیلی آچکی ہے۔ لہٰذا اس وقت ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق انقلاب پر جوں کا توں عمل کیا جائے گا یا اس کے لئے کسی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اوپر بیان کئے پہلے پانچ مراحل میں قطعاً کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے......(لیکن) دور حاضر میں حالات واقعتاً اس درجے تبدیل ہو گئے ہیں کہ انقلاب کے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کے بارے میں اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک طرف مسلمان دوسری طرف کفار تھے، اور حربی کافر کی گردن مارنے میں کسی کو کیا جھجک ہو سکتی تھی۔ جبکہ آج صورتحال یہ ہے کہ اِدھر بھی مسلمان اور اُدھر بھی مسلمان۔ ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں، ہیں تو مسلمان۔ بھٹو، بے نظیر، ضیاء الحق، نواز شریف اور پرویز مشرف سب مسلمان ہیں"۔(کتاب "رسول انقلاب کا طریقہ انقلاب" ص55-58)

لہٰذا ان دو وجوہات کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب اپنے فہم سے اخذ کردہ منہج سے ترمیم و انحراف کی راہ اپناتے ہوئے عمرانی ارتقاء جیسی نام نہاد اصطلاحات سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی کی طرح مغربی

تہذیب کے نتیجے میں وجود میں آنے والی جمہوریت کے دیئے ہوئے دو طریقے یعنی......... انتخابات اور پُر امن مظاہرے......... کو کسی نہ کسی صورت میں شریعت کے نفاذ کے لئے قبول کر لیتے ہیں۔

فرق صرف اتنا ہے کہ جس طرح جماعت اسلامی دو جمہوری طریقوں میں سے انتخابات کو شریعت کے نفاذ کا واحد راستہ سمجھتی ہے اور اس انتخابی عمل میں کامیابی کے حصول کے لئے پُر امن مظاہروں کو ثانوی حیثیت میں اختیار کرتی ہے۔ جبکہ تنظیم اسلامی انتخابات کو کارگر نہ سمجھتے ہوئے دوسرے مغربی طریقے یعنی ”پُر امن مظاہروں“ (جس کو وہ پر امن احتجاجی تحریک سے بھی تعبیر کرتی ہے) کو شریعت کے نفاذ کے لئے سب سے مؤثر ہتھیار قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم اس مؤقف کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> ”عمرانی ارتقاء (Social Evolution) کے نتیجے میں آج اس بات کا امکان موجود ہے کہ بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کی جاسکتی ہے۔ آج یہ مانا جاتا ہے کہ ریاست اور ہے، حکومت اور ہے۔ شہری ریاست کے وفادار ہوتے ہیں، حکومت کے نہیں۔ حکومت کی تبدیلی تو عوام کا حق ہے۔ اُس وقت (یعنی دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) تک ابھی عمرانی ارتقاء اِس سطح تک نہیں پہنچا تھا، لہٰذا حکومت اور ریاست گڈمڈ تھے۔ اب یہاں پر بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں، ایک الیکشن کا راستہ اور ایک احتجاجی تحریک (Agition) کا راستہ۔ الیکشن کے راستے سے نظام نہیں بدل سکتا، خواہ الیکشن کتنا ہی شفاف اور منصفانہ ہو۔ اس سے تو صرف نظام کو چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں“۔ (کتاب ”رسول انقلاب کا طریقہ انقلاب“ ص59)

پھر جس طرح جماعت اسلامی پاکستان کے آئین و دستور کو اسلامی قرار دیتی ہے، اسی طرح تنظیم بھی اس پاکستان میں رائج دستور کو اسلامی سمجھتے ہوئے یہ مؤقف رکھتی ہے کہ:

''حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو گی چنانچہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جاسکے گا........پاکستان کے دستور میں یہی چیز ہے جو قرار داد مقاصد کی صورت میں طے کر دی گئی ہے اگر اس شق کو صد فیصد نافذ کر دیا جائے تو دستوری لحاظ سے پاکستان اسلامی مملکت قرار پاجائے گا''۔(تنظیم اسلامی کا تعارف اور اس کا انقلابی منشور، ص7)

یعنی اگر صرف دستوری سطح پر شریعت نافذ کر دی جائے تو کسی منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔اسی طرح ڈاکٹر صاحب ایک جگہ کہتے ہیں:

''الحمد للہ !ہمارے ملک میں دستور کی اساس قرار داد مقاصد میں اللہ کی حاکمیت کا یہ اقرار صراحت کے ساتھ موجود ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے........گویا دستوری سطح پر خلافت کا اعلان کر دیا گیا''۔(خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص91)

تنظیم کے مقصدِ قیام اور طریقہ کار میں تضادات:

جس طرح جماعت اسلامی کے مقصدِ قیام اور طریقہ کار میں تضادات و اشکالات کی نشاندہی کی گئی تھی، بالکل اسی طرح تنظیم اسلامی کے مقصدِ قیام اور طریقہ کار یا بالفاظ دیگر اس کے ''منہج''میں واضح تضادات موجود ہیں، جس کی وجہ سے اس کا مقصدِ قیام کہ:

''کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے، یعنی اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام، بالفاظ دیگر ''اسلامی انقلاب''اور اس کے نتیجے میں ''نظام خلافت علیٰ منہاج النّبوت'' کے قیام''۔

ہی سرے سے فوت ہو جاتا ہے........اور اس کی بنیادی وجہ تنظیم ہی کے مقرر کر دہ بنیادی اصول:

”آئندہ تنظیم اسلامی کا نظام مغرب سے درآمد شدہ قانونی اور جمہوری اصولوں کے بجائے قرآن و سنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا“۔

سے انحراف ہے۔ چنانچہ اب ہم ان تضادات کا مختصراً جائزہ لے لیتے ہیں تاکہ اس حوالے سے شرعی نقطۂ نظر بھی واضح ہو سکے:

(۱)........سب سے پہلا تضاد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کرنے کا دعویٰ کیا لیکن پھر اس کے لئے تدریجی مراحل کو اپنے فہم کے مطابق خود ہی اخذ کرتے ہوئے اقامت دین یا بالفاظ دیگر شریعت کے نفاذ کے لئے معین کر لیا۔ حالانکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اور اس کے بعد سلف میں سے کسی بھی مفسر و محدث اور فقیہی نے اس طرح کے تدریجی مراحل کو اقامت دین کے لئے بطور ”شرعی حکم“ کے کہیں بیان نہیں کیا۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

(۲)........دوسرا تضاد یہ ہے کہ اگر فی الوقت یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اقامت دین کے لئے ڈاکٹر صاحب کا بیان کردہ منہج ہی دراصل منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقامت دین کے لئے شریعت کا مقرر کردہ طریقہ ہے، تو پھر کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس شرعی طریقہ اور منہج میں ترمیم یا تبدیلی کر دے؟

(۳)........تیسرا تضاد جو ڈاکٹر صاحب کے مؤقف میں پایا جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اقامت دین کے لئے ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشرے میں اس لحاظ سے فرق واقع ہو گیا کہ وہ کفر کا معاشرہ تھا اور ہمارا معاشرہ مسلمان معاشرہ ہے لہٰذا ہم منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے پانچ مرحلوں کو جوں کا توں اختیار کریں گے البتہ چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم میں اجتہاد کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس مرحلے میں تبدیلی اور ترمیم کریں گے۔ اس ضمن میں دو سوالات خود بخود پیدا ہوتے ہیں:

الف:.........جب ڈاکٹر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ اقامت دین کے لئے جو کام ہم نے کرنا ہے وہ کفر کے معاشرے میں نہیں بلکہ مسلمانوں کے معاشرے میں کرنا ہے لہٰذا اس کے لئے ہمیں اجتہاد کی راہ اختیار کرتے ہوئے کوئی اور طریق کار ڈھونا پڑے گا۔

اس ضمن مین سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی انقلاب کے لئے کیوں اُس طریق کار کو مسلمانوں کے معاشرے میں استعمال کرنے پر مصر ہیں جو کہ کفر کے معاشرے میں اسلامی انقلاب کے لئے اختیار کیا گیا۔

ب:.........دوسرا سوال یہ ہے کہ جب کفر و اسلام کی بناء پر معاشروں میں فرق واقع ہو گیا تو اس سلسلے میں منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چھٹے مرحلے ''مسلح تصادم'' کو اختیار کرنے کے معاملے میں از خود ایک نیا اجتہاد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی اور یہ اجتہاد آخر چھٹے مرحلے میں ہی کیوں کیا گیا ؟باقی مراحل میں کیا کفر و اسلام کے معاشروں کی بناء پر کوئی فرق واقع نہیں ہوا؟

ج:.........اور کیا جب کفر و اسلام کی بناء پر معاشروں میں فرق واقع ہو جائے اور اسلامی انقلابی یعنی اقامت دین کے لئے مسلمانوں کے معاشرے میں کام کرنا ہو تو شریعت میں اس حوالے سے کوئی واضح اور باقاعدہ ہدایات واحکامات موجود نہیں جس کی وجہ سے اجتہاد کی نوبت آرہی ؟

(۴).........پھر ایک تضاد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بقول موجودہ زمانے میں عمرانی ارتقاء کی صورت میں حکومت بدلنے دو طریقے رائج ہیں:

(i) انتخابات

(ii) احتجاجی تحریک

چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے حکومت بدلنے کے پہلے طریقے یعنی انتخابات کے اختیار کرنے پر جماعت اسلامی پر سخت تنقید کرتے ہیں اور اسی بناء پر ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی

کہ اس ذریعہ سے حکومت تو بدلی جاسکتی ہے "نظام" نہیں بدلا جاسکتا لیکن خود ہی کے بیان مطابق حکومت بدلنے کے دوسرے طریقے یعنی پرامن احتجاجی تحریک کو نظام بدلنے کے لئے اختیار کرلیا اور اسی کو اجتہاد کہتے ہوئے پچھلی صدی میں ہندوؤں کے رہنما گاندھی اور ایرانی انقلاب جو دراصل "رافضی انقلاب" تھا، اس کو نمونہ بناتے ہوئے اس کو منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قرار دے دیا بلکہ اس طریقے کو اقامت دین کے لئے وہ واحد طریقہ قرار دے دیا جس کے ذریعہ ہی کامیابی ممکن ہے۔ جیسا کہ وہ ان تمام چیزوں کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:

> "میں نے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کرتے ہوئے، اس سے استنارِ نور کرتے ہوئے آپ کے سامنے وہ طریق انقلاب رکھ دیا ہے کہ اس کو اختیار کریں گے تو کامیابی کا امکان ہے، ورنہ آپ کا خلوص واخلاص اپنی جگہ پر، کامیابی ممکن نہیں"۔ (رسول انقلاب کا طریقہ انقلاب، ص64)

اس ضمن میں درج ذیل سوالات ہیں جن کے جواب مطلوب ہیں:

الف:........پہلا سوال یہ ہے کہ معاشرہ چاہے وہ کفر کا ہو یا مسلمانوں کا، حکومت بدلنے کے لئے کیا شریعت نے کوئی طریقہ کار وضع نہیں کیا جس کی وجہ سے نام نہاد عمرانی ارتقاء کی کے نام پر جو دو جمہوری طریقے رائج کردیئے گئے ہیں، ان کو اختیار کرنے کی ضرورت پیش آگئی؟

ب:........دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ مسلم معاشرے میں شریعت کے نفاذ کے لئے ہمارے اسلاف نے کوئی شرعی طریقہ اختیار کیا ہو، جس کی وجہ ہمیں گاندھی یا رافضیوں کی طرف رجوع کرنے کی حاجت محسوس ہو رہی ہے؟

(۵)........پانچواں تضاد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک طرف جمہوریت کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ:

"انسانوں کی حاکمیت، خواہ شخصی ہو یا اجتماعی، قرآن کی رو سے شرک ہے۔ جمہوریت کا اصول Popular Sovereignty ہے۔ یہ بھی اتنا ہی بڑا "کفر و شرک" ہے جتنا کسی انسان کی انفرادی حاکمیت۔ فرعونیت، نمرودیت، اور عوامی حاکمیت میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ بقول اقبال

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص76)

اس کے ساتھ ساتھ تنظیم کے دستور میں لکھا ہے کہ:

"تنظیم اسلامی نہ بحیثیت جماعت ملکی انتخابات میں حصہ لے گی، نہ ہی اپنے کسی رفیق / رفیقہ کو اجازت دے گی کہ وہ کسی انتخاب میں خود بحیثیت امیدوار کھڑا / کھڑی ہو یا کسی دوسرے امیدوار یا جماعت یا محاذ کے حق میں کنویسنگ کرے۔ اس معاملے میں خلاف ورزی اخراج عن التنظیم پر بھی منتج ہو سکے گی۔ (دستور تنظیم اسلامی، ص14)

لیکن دوسری طرف یہی دستور انتخابات میں رائے دہی کے عمل کو "قومی امانت" سمجھتے ہوئے رفقائے تنظیم کو ووٹ ڈالنے کی اجازت بھی دیتا ہے:

"البتہ رفقاء / رفیقات تنظیم اپنا حق رائے دہی، جو اصلاً قومی امانت ہے، ادا کرنے کے لئے کسی امیدوار کو ووٹ دے سکیں گے / گی"۔ (دستور تنظیم اسلامی، ص15)

بس اس کے ساتھ تنظیم کا دستور یہ شرط عائد کرتا ہے کہ امیدوار ظاہری اعتبار سے فاسق و فاجر نہ ہو اور دوسرا یہ کہ امیدوار کا تعلق ایسی جماعت سے نہ ہو جس کا منشور و نظریات میں کوئی بات خلاف

شریعت نہ ہو۔ گویا کہ جمہوریت کے نظامِ بد کو چلانے کے لئے تنظیم کو نیک اور دیندار مسلمان مطلوب ہیں۔

یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر جمہوریت کے تحت نظام حکومت چلانے کے جو مختلف طریقہ کار وجود میں آئے، تنظیم اسلامی حکومت چلانے کے لئے ان پر جماعت اسلامی کی طرح ''اسلامی'' لفظ لگا کر اختیار کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی:

'' خلافت سے قریب ترین نظام صدارتی ہے لیکن باقی سارے نظام بھی مباح ہیں کوئی پابندی نہیں ہے''۔(تنظیم اسلامی کا تعارف اور اسلام کا انقلابی منشور، ص8)

ڈاکٹر صاحب ایک جگہ کہتے ہیں:

''عہد حاضر میں جو خلافت بنے گی وہ ''امرھم شوری بینھم'' کے اصول کے تحت ہی بنے گی۔ مسلمانوں کے نزدیک جو شخص اہل ہے وہ اسے اپنا ووٹ دیں گے۔ان کی اس رائے سے خلیفہ المسلمین منتخب ہو گا۔اور اس طرح اجتماعی نظام وجود میں آئے گا''۔(خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص83)

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

''قرآن حکیم میں سیاسی اور معاشی نظام کا کوئی ڈھانچہ سرے سے کوئی موجود نہیں ہے ۔سیاسی نظام کے صرف اصول دیئے گئے ہیں........اسی طرح اس آیت میں اولی الامر کی اطاعت کا حکم تو دیا گیا ہے مگر ان کے تقرر کا طریقہ کو واضح نہیں کیا گیا۔ تقرر کے طریقے کی وضاحت نہ ہونے کی حکمت یہی ہے کہ ہم اپنے تمدنی حالات کے لحاظ سے اور معاشرتی ارتقاء کے مطابق بہتر سے بہتر قابل عمل طریقہ خود اختیار کر سکیں........اولی الامر کے تقرر کے لئے انتخابات کا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے مگر الیکشن کے نظام کو اسلامی ریاست میں

حدود و قیود کا پابند کرنا ہو گا۔ تاہم روح عصر کا تقاضا کہ انتخابات زیادہ سے زیادہ Broad Base ہونا چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں (شہریوں) کی رائے کا اس میں عمل دخل ہو"۔ (خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص98،84)

آج کوئی بھی اس بات سے اختلاف نہیں کرے گا کہ پاکستان رائج موجودہ جمہوری نظام کسی بھی طرح نام نہاد "اسلامی جمہوریت" کی تعریف پر بھی صادق نہیں آتا، چنانچہ تنظیم خود بھی انتخابات میں نہ اجتماعی طور پر حصہ لیتی ہے اور نہ ہی اس کو نظام بدلنے کا صحیح طریقہ سمجھتی ہے اور اس میں بطور امیدوار یا پروموٹر کے حصہ لینے والے کو تنظیم سے خارج سمجھتی ہے لیکن کیا یہ عجیب تضاد نہیں کہ دوسری طرف اسی نظام کے تحت ووٹ دینے کے عمل کو "اصلاً قومی امانت ہے" کہہ کر جائز قرار دے دیتی ہے۔

(٦)......... جس طرح جماعت اسلامی اس مغالطے کا شکار ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہے اسی طرح تنظیم اسلامی بھی اسی خلط مبحث میں مبتلا ہے۔ باوجود اس کے کہ تنظیم اسلامی اس بات کو تسلیم کرتی ہے اگر دستور میں کتاب و سنت کی مکمل بالادستی کو قبول نہ کیا گیا ہو تو ایسا کرنا "کفر و شرک" قرار پائے گا:

"اگر اس شق کو (یعنی کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو گا) صد فیصد نافذ کر دیا جائے تو دستوری لحاظ سے پاکستان اسلامی مملکت قرار پائے جائے گا۔ اگر استثنیٰ ہو گی تو یہ کفر ہے فسق اور شرک ہے"۔ (تنظیم اسلامی کا تعارف اور اسلام انقلابی منشور، ص7)

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

"چنانچہ آئینی سطح پر کسی استثناء کے بغیر کتاب و سنت کی کامل بالادستی قبول کرنی ہو گی۔ اگر اس میں ایک چیز بھی نکال دی تو پورا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ پھر ہم اس وعید کی زد میں ہوں گے جو سورۃ البقرۃ کی آیت 85 میں بنی اسرائیل کو سنائی گئی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾

"تو کیا کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو تو تم میں سے جو شخص یہ کام کرے اس کا بدلہ اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کو رسوائی ہو اور آخرت میں ان کو سخت عذاب کی طرف لوٹا یا جائے گا۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے"۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس وعید کا مخاطب بننے سے محفوظ رکھے ۔ آمین"۔ (خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص92)

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دستور پاکستان میں شریعت کا مقرر کردہ ایک حکم بھی ایسا نہیں جس میں کتاب و سنت کی مکمل پابندی کی گئی ہو (جس کی تفصیل پیچھے آچکی) بلکہ دستوری سطح پر "قرارداد مقاصد" کے ذریعے اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ حاکمیت اللہ کی ہوگی اور کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا، اس کے باوجود دستور کو دوسری دفعات کے تحت ایسی بیڑیاں پہنادی گئی ہیں کہ جس کے ذریعے شریعت کا نفاذ بازیچۂ اطفال بن گیا ہے۔ جس کا اقرار خود ڈاکٹر صاحب کرتے ہیں:

" لیکن ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ایک مدت تک یہ قرار داد مقاصد دستور کا دیباچہ بنی رہی۔ دستور کے واجب العمل حصہ میں نہ ہونے سے اس قرارداد کی بنیاد پر حکومت کے خلاف یا کسی قانون کے خلاف کوئی مقدمہ دائر نہ ہو سکتا تھا. لیکن ضیاء الحق مرحوم نے قرارداد مقاصد کو دستور کا جزو تو بنادیا مگر دستور کے اندر اس قرارداد سے متصادم جو دفعات تھیں ان کو رہنے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ ہائی کورٹ نے قرارداد مقاصد کو اولیت دے کر ایک فیصلہ کر ڈالا، جبکہ سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ دستور

کی تمام دفعات برابر ہیں، کسی دفعہ کو دوسری دفعہ پر فوقیت حاصل نہیں"۔(خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص100)

پھر اس پر مزید یہ کہ شریعت کے نفاذ کو دستوری سطح پر مکمل طور پر حکومت اور پارلیمنٹ کی صوابدید قرار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو شریعت کا نفاذ کریں اور اگر نہیں، اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ڈاکٹر صاحب اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

"(۲)پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی اگر کسی مجوزہ قانون کے بارے میں دریافت کرے کہ کسی قانون یا اس کا کوئی حصہ کتاب و سنت سے متصادم نہیں ہے تو وہ (یعنی اسلامی نظریاتی کونسل)اس کو اپنے مشورے سے مطلع کرے گی۔واضح رہے کہ کوئی مجوزہ قانون اسلامی نظریاتی کونسل کو صرف اس وقت بھیجا جائے گا جب اسمبلی کے کل ارکان میں سے کم از کم 20 فیصد ارکان اس کی ضرورت محسوس کریں........

(۳)جب صدر یا کسی صوبے کا گورنر (گویا مرکزی یا صوبائی حکومت) کسی قانون کو اسلامی نظریاتی کونسل سے مشورے کے لئے کونسل کو ارسال کریں تو وہ اپنا مشورہ ارسال کرے گی۔لیکن ان تمام صورتوں میں اسلامی نظریاتی کونسل جو مشورہ دے گی اس کی حیثیت صرف سفارش کی ہو گی۔مرکزی پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی کو اختیار ہو گا کہ وہ اس مشورے کو مان لیں یا مسترد کریں۔اسی طرح حکومت بھی مشورے کے پابند نہ ہو گی۔گویا کتاب و سنت کے خلاف کوئی قانون بنانے کا اعلان مکمل طور پر منتخب ایوانوں کے فیصلے پر منحصر ہے"۔(خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص101)

اسی طرح ملک میں قائم نام نہاد شرعی عدالتیں بھی دھوکہ و فریب کے سوا کچھ نہیں۔اس کے اسباب درج ذیل ہیں:

(i) ....سب سے بڑا دھوکہ شرعی عدالتوں کے نام پر یہ دیا گیا کہ ''دستورِ پاکستان'' جیسی مقدس دستاویز کو شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر کر دیا گیا۔

(ii).........دوسرا بڑا دھوکہ یہ دیا گیا کہ ملک میں رائج طاغوتی نظام قوانین وضوابط کو بھی شرعی دائرہ کار سے باہر کر دیا گیا: "Any Law relating to the procedure of any court or tribunal"

(iii)......... شریعت کے بیان کردہ وہ عائلی قوانین جن کو انگریز سامراج بھی نہ چھیڑ سکا تھا، اس کی جگہ ملک کے ایک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (محمد ایوب خان) کی جانب سے ایک منکر حدیث کے زیر نگرانی از سر نو تدوین کرائے گئے عائلی قوانین کو نافذ کر دیا گیا اور ان عائلی قوانین کو بھی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر کر دیا گیا۔

(iv).........سب سے بڑھ کر شرعی عدالتوں کا درجہ ملک میں رائج طاغوتی نظام عدالت سے کم رکھا گیا یعنی یہ کہ شرعی عدالت کا فیصلہ تو دوسری عدالت مثلاً سپریم کورٹ میں تو چیلنج کیا جا سکتا ہے لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ شرعی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

شرعی عدالتوں کے بارے میں ان تمام باتوں کا اعتراف ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص102)

ان تمام باتوں کے باوجود کیا یہ عجیب تضاد نہیں کہ تنظیم اور ڈاکٹر صاحب دستورِ پاکستان کو ''اسلامی'' کہنے اور اس کو خلافت سے تعبیر کرتے نہیں تھکتے.........!!

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام باتوں کے اعتراف کے باوجود میں دستورِ پاکستان کو ''اسلامی'' کہنا دراصل شریعت کے ساتھ کھلم کھلا استہزا و تمسخر ہے، جو کہ شریعت کے نظر میں کفر ہے۔

تضادات کی اصل وجہ:

ان تمام تضادات کی اصل وجہ شاید یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ:

"قرآن حکیم میں سیاسی اور معاشی نظام کا کوئی ڈھانچہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ سیاسی نظام کے صرف اصول دیئے گئے ہیں........ جبکہ عہد حاضر میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو گیا ہے۔ آج کی اہم ترین شے سیاسی اور دستوری ڈھانچہ ہے۔ اس لئے جو کچھ دستور میں طے ہو جائے گا گاڑی اسی کے مطابق چلے گی"۔ (خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص84)

چنانچہ جب یہ سمجھ لیا جائے کہ چونکہ قرآن میں سیاسی نظام کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، باقی تفصیل موجود نہیں اور فی زمانہ ضروری ہے کہ اسلامی اصول ایک دستور کی صورت میں طے ہو جائیں!

تو سوال یہ ہے کہ کیا شریعت صرف قرآن کریم کا نام ہے جس کی وجہ سے اگر کسی چیز کی تفصیل قرآن کریم میں نہ ملے تو پھر اس کے لئے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا عمل اور اسلاف کے فتاویٰ و اقوال موجود نہیں جس کی وجہ سے اس کی تفصیل طے کرنے کے لئے کسی اور طریقہ کار کی طرف رجوع کیا جائے؟

اور دوسرا سادہ سا سوال یہ ہے کہ جتنے بھی ارکان اسلام ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، کیا ان سب کے تفصیلی احکامات یعنی فرائض و واجبات، سنت و مباحات اور مکروہات و نواقض سب کے سب قرآن کریم میں موجود ہیں کہ جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ کیونکہ قرآن کریم میں ان سب سے متعلق صرف اصول بیان کر دیئے گئے ہیں اور تفصیلی ڈھانچہ موجود نہیں لہٰذا ہم اس کے لئے آج عمرانی ارتقاء کی صورت میں جو تبدیلیاں آگئی ہیں ان کے مطابق ان کے تفصیلی احکامات طے کریں گے؟

ظاہر ہی بات ہے کہ ایسا کہنے والے کا کلام مردود اور باطل ہے کیونکہ ان تمام چیزوں کا تفصیلی ڈھانچہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور اسلاف کی رائے اور عمل کے مطابق طے ہو چکا ہے لہٰذا کسی اور نظام یا اس کی وضع کردہ اصطلاحات کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا اسی طرح سیاسی نظام کا تفصیلی ڈھانچہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور سلف صالحین کے فتاویٰ اور عمل کی صورت میں موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے عمرانی ارتقاء اور اس کے مراحل کی طرف رجوع کرنے کی حاجت محسوس ہو رہی ہے؟؟

یہ ہیں وہ تضادات جن کی وجہ سے تنظیم اسلامی کے مقصدِ قیام کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے اور اقامت دین کی نسبت سے کی جانے والی ساری کوششیں غیر شرعی طریقہ کار اختیار کرنے کی وجہ سے لاحاصل اور بیکار ہو جاتی ہیں۔

جمعیت علمائے اسلام کے منہج و فکر کا تجزیہ

جمعیت علمائے اسلام کے قیام کا مقصد:

جمعیت علمائے اسلام کے نصب العین کو سمجھنے کے لئے اس کے دستور کا سرسری جائزہ لے لیتے ہیں تاکہ جمعیت کے قیام کے اغراض و مقاصد اور اس کے موجودہ لائحہ عمل کو سمجھا جاسکے۔جمعیت کے دستور میں لکھی چند بنیادی دفعات کچھ یوں ہیں:

''جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) علماء اسلام کی رہنمائی میں مسلمانوں کی منتشر قوتوں کو جمع کرکے اقامت دین اور اشاعت اسلام کے لئے منظم جدوجہد کرنا۔نیز اسلام اور مرکز اسلام یعنی جزیرۃ العرب اور شعائر اسلام کی حفاظت کرنا۔

(۳) پاکستان میں صحیح حکومت اسلامیہ برپا کرنا اور اسلامی عادلانہ نظام کے لئے ایسی کوشش کرنا جس سے باشندگان پاکستان ایک طرف انسانیت کش سرمایہ داری اور دوسری طرف الحاد آفریں اشتراکیت کے مضر اثرات سے محفوظ رہ کر فطری معاشرتی نظام کی برکتوں سے مستفید ہو سکیں۔

(۴) مسلمانان پاکستان کے دلوں میں جہاد فی سبیل اللہ، ملکی دفاع، استحکام اور سالمیت کے لئے جذبۂ ایثار و قربانی پیدا کرنا۔

(۵) مسلمانان عالم سے اقامت دین، اعلائے کلمۃ اللہ کے سلسلے میں مستحکم روابط کا قیام۔

(٦) تحریر و تقریر اور دیگر آئینی ذرائع سے باطل فرقوں کی فتنہ انگیزی مخرب اخلاق اور مخالف اسلام کاروائیوں کی روک تھام کرنا۔

مقصدِ قیام کا مبہم اور غیر واضح طریقہ کار:

جمعیت کے دستور میں درج ان بنیادی دفعات کا اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ حقیقت ہر کسی پر منکشف ہو جائے گی کہ بظاہر دستور میں اقامت دین کا ذکر موجود تو ہے لیکن اس کے لئے عملاً کوئی باقاعدہ طے شدہ لائحہ عمل موجود نہیں! جیسا کہ جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے دستور میں باقاعدہ لکھا ہے کہ ان کا عملی طور پر طریقہ کار یہ ہو گا۔ مثلاً انتخابات میں حصہ لیں گے یا پر امن احتجاجی تحریک برپا کریں گے یا پھر مسلح جدوجہد کریں گے، اس کی کوئی وضاحت جمعیت کے دستور میں موجود نہیں۔

چنانچہ جو جماعتیں اپنے آپ کو دستور کے مطابق چلنے کی پابند سمجھتی ہوں اور اس کے لئے اپنا ایک دستور وضع بھی کرتی ہوں، لیکن ان میں سے کسی جماعت کے دستور میں باقاعدہ طور اس کا عملی طریقہ کار مذکور ہی نہ ہو تو ظاہر سی بات ہے کہ اس کے لئے کسی عملی طریقہ کار پر چلنا اور اسی طریقہ کار کی طرف لوگوں کو بلانا کسی صورت ممکن نہیں، سوائے اس صورت کہ:

"چلو اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی"۔

پھر بھی اگر کوئی یہ کہے کہ جمعیت کے مقاصد میں دین و شریعت کا نفاذ شامل ہے اور اس کے لئے عملی طریقہ کار بھی موجود ہے! تو سوال یہ ہے کہ وہ کونسا طریقہ کار ہے جس کو جمعیت نے باقاعدہ طور پر اختیار کیا ہوا ہے؟ سوائے اس کے کہ وہ مغرب کے عطا کردہ جمہوری طریقے یعنی انتخابات اور پر امن احتجاج تک محدود ہے۔

چنانچہ اس حوالے سے واضح موقف جس کا اعادہ جمعیت کے قائد مولانا فضل الرحمن اور اس کے دیگر رہنما بارہا کرتے رہے ہیں کہ:

”ہم ملک میں جمہوری و آئینی راستوں سے اور پارلیمنٹ کے ذریعے شریعت کے نفاذ پر یقین رکھتے ہیں اور ہم پاکستان میں مسلح طریقے سے شریعت کے نفاذ کو صحیح نہیں سمجھتے “۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں اصلاحِ معاشرہ اور اقامت دین کے عنوان سے کام کرنے والی اکثر تحریکیں نہ صرف مسلم ملکوں میں رائج آئین و دستور کے تحت کام کرنے کا راستہ اختیار کرتی ہیں ،اس بات سے قطع نظر کہ وہ آئین و دستور کفریہ و شرکیہ ہی کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح یہ جماعتیں اپنے وضع کردہ دستور کے مطابق چلنے کی پابند ہوتی ہیں چاہے اس میں خلاف شریعت امور ہی پائے جاتے ہوں سوائے اس کے کہ اگر اس دستور میں خود ہی باقاعدہ طور پر ترمیم نہ کرلی جائے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ وہ جماعت جس کی شناخت ہی ”علماء“ ہوں مگر اس کے باوجود جمعیت جمہوریت، دستور اور آئین جیسی اصطلاحات (جن کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے ان) کو اختیار کرنے کو ہی اصل طریقہ سمجھے اور ان ہی کا اپنے آپ کو پابند سمجھے، تو اس کے کتنے قبیح اور بھیانک نتائج خود اس جماعت کے طرز عمل اور طریقہ کار میں اور عام لوگوں کے فکر و عقیدے پر پڑ سکتے ہیں۔

اور فی الواقع حقیقت یہ ہے کہ جمعیت نے گزشتہ دو تین دہائیوں میں جو طریقہ کار اقامت دین اور شریعت کے نفاذ کے لئے جمہوری، دستوری اور آئینی جیسی اصطلاحات کی چھتری تلے اختیار کیا ہے اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج کا احاطہ کرنا اور اس کو ضبط تحریر میں لانا آسان نہیں۔اس ضمن میں ہم اس کردار اور اس کے نتائج کو کچھ نکات کی صورت میں واضح کریں گے:

(i)رافضہ عورت کی حکمرانی کو قبول کرنا:

ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کسی جگہ اسلامی نظام اپنی پوری شرائط کے ساتھ بھی قائم ہو، لیکن اس کے باوجود وہاں حاکم کسی "عورت" کو نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً))

"وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جو عورت کو اپنا حاکم بنالے"۔(صحیح البخاری،ج13ص337رقم الحدیث:4083)

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ تمام گراوٹ اور پستی کے باوجود کبھی کوئی عورت بطور خلیفہ مقرر نہیں ہوئی۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ملک جو کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا وہاں مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی عورت کو بطور حاکم دو دفعہ چنا گیا جو کہ ایک "رافضہ" یعنی شیعہ عورت تھی۔ اس پر مزید افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس حکومت کو سپورٹ کرنے والوں میں بلکہ اس میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر کے اس کو "سندِ جواز" عطا کرنے والوں میں سب سے پہلے جس دینی جماعت کا نام آتا ہے وہ جمعیت علمائے اسلام ہی ہے۔

گو کہ قائد جمعیت نے ابتداء میں عورت کی حکمرانی کو حرام قرار دیا لیکن بعد میں قائدِ جمعیت نے اس رافضہ عورت کی حکومت کو نہ صرف سپورٹ کیا بلکہ وہ اس دوران اعلیٰ حکومتی عہدے "چیئرمین فارن افیئر کمیٹی" پر فائز ہو گئے اور دیگر مراعات سے بھی استفادہ کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شریعت میں حاکم یا خلیفہ، ایک عورت کو نہیں بنایا جاسکتا جبکہ نظام بھی اسلامی ہو۔ تو پھر ایک ایسا نظام جو کہ اسلامی نظام خلافت کہلانے کا کسی بھی صورت میں حقدار نہ ہو بلکہ وہ کفر و شرک پر مبنی قوانین پر چل رہا ہو اور اس پر حکومت کرنے والی ایک عورت ہو وہ بھی رافضہ، تو کیا ایسی حکومت کو شرعی طور پر کسی صورت قبول کیا جاسکتا ہے، چہ جائے کہ اس حکومت میں شامل ہو کر اس کے عہدوں اور مراعات سے مستفید ہوا جائے؟

ہاں! یہ کام وہ ہی کر سکتا ہے جس کو اس بات پر فخر ہو کہ وہ "جمہوری اقدار" (جو کہ مغربی ہونے کے ساتھ ساتھ کفریہ اور شرکیہ بھی ہیں ان پر) یقین رکھتا ہے۔

افسوس! یہ سب کام پورے ملک کے علماء اور خاص کر جمعیت میں شامل اہل علم کے سامنے ہوتا رہا اور وہ خاموش رہے؟

(ii) امریکہ کا ساتھ دینے والے ایک خبیث شخص کی حمایت کرنا:

نائن الیون کے بعد جب امریکہ کی جانب سے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور امارت اسلامیہ افغانستان کے سقوط میں جس خبیث اور لعین شخص نے پاکستان میں سب سے اہم کردار ادا کیا وہ جنرل پرویز مشرف تھا، جس نے پاکستان کی فضاء اور اور بحر وبر امریکہ کے حوالے کر دیئے اور پاکستان کو ایک امریکی کالونی میں تبدیل کر دیا۔

تو سوال یہ ہے کہ ایسا شخص مسلمانوں پر حکمرانی کا کسی صورت حق رکھتا ہے؟ کیا ایسا شخص شرعی طور پر فوراً واجب العزل نہیں؟ اور کیا شریعت ایسے شخص کے خلاف خروج کو فوراً واجب نہیں کرتی؟ اور کیا ایسے شخص کے کفر و شرک شک ہو سکتا ہے کہ جس نے مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کی عسکری و غیر عسکری غرضیکہ ہر لحاظ سے مدد و نصرت کی ہو؟

لیکن پھر بھی جمعیت نے اس خبیث شخص کے تحت منعقد ہونے والے الیکشن میں دیگر دینی جماعتوں (بشمول جماعت اسلامی) کے ساتھ مل کر ایم ایم اے (M.M.A) کے پلیٹ فارم سے نہ صرف حصہ لیا بلکہ اس خبیث شخص کو جب آئینی و دستوری سطح پر اپنی حیثیت تسلیم کرانے کی ضرورت پڑی تو اس وقت ایم ایم اے نے ہی اس کو اپنا کندھا فراہم کیا۔

(iii)صوبہ سرحد و بلوچستان میں حکومت ملنے کے باوجود شریعت کا عدم نفاذ:

اسی خبیث پرویز کے تحت منعقد ہونے والے الیکشن کے نتیجے میں صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت قائم ہوئی اور صوبہ بلوچستان میں ایم ایم اے نے اُس جماعت کے ساتھ مل کر حکومت بنائی جس کے قیام میں اہم کردار اسی خبیث شخص نے ادا کیا تھا۔

بہرحال !دونوں صورتوں میں اقتدار ملنے کی صورت میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دونوں صوبوں میں یا کم از کم صوبہ سرحد کی سطح پر ہی (جبکہ وزیر اعلیٰ خود جمعیت کا تھا) اسلامی حدود و تعزیرات کی صورت میں شریعت کا نفاذ کر دیا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسی طرح ان دونوں صوبائی حکومتوں نے اس خبیث شخص کے تحت امریکی و نیٹو افواج کی جاری و ساری مدد و نصرت (جس کو ہم "نیٹو سپلائی" کے نام سے جانتے ہیں اور جو کہ ان دونوں صوبوں کے ہی راستے طورخم اور چمن کے ذریعے جاتی ہے اس) کو حکومتی سطح پر روکنے کے بجائے اُلٹا تحفظ فراہم کیا۔ کیا شریعت میں ایسی معاونت اور تحفظ فراہم کرنے والوں کے شرعی حکم سے جمعیت علماء اسلام اور جماعت اسلامی کے اہل علم واقف نہ تھے کہ جو ان دونوں حکومتوں کے اس فعل سے راضی رہ کر خاموش تماشائی بنے رہے ؟ آج یہ دونوں جماعتیں کس منہ سے "نیٹو سپلائی کی بحالی" پر شور مچا رہی ہیں جبکہ کل تک وہ اختیار رکھنے کے باوجود اس کو تحفظ فراہم کرتی رہیں !اور خود قائدِ جمعیت تو در پردہ ابھی بھی افغانستان سے نیٹو کے جلد انخلا کے ہی قائل نہیں۔ بی بی سی کے مطابق اس کے لئے انہوں نے برسلز میں نیٹو ہیڈ کوارٹر کا ایک خفیہ دورہ کیا۔ 21 اپریل 2011 کو روزنامہ امت میں شائع ہونے والی خبر کی جھلکیاں بھی ذرا ملاحظہ کیجئے:

> "قومی اسمبلی کی کشمیر کمیٹی کے وفد نے مولانا فضل الرحمن کی قیادت میں پیر کو برسلز میں میں نیٹو کے ہیڈ کواٹر کا غیر اعلانیہ دورہ کیا جہاں انہیں نیٹو کے چار اسسٹنٹ سیکریٹری جنرلز نے مختلف موضوعات پر بیریفنگ دی........جے یو آئی سربراہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے نیٹو

حکام پر زور دیا ہے کہ افغانستان سے ان کا اتنا جلدی نکلنا مناسب نہ ہو گا........پاکستانی سفارت خانے کے ایک اہلکار نے دبے لفظوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کسی حد تک ایک خفیہ ملاقات تھی........اطلاعات کے مطابق پینتالیس پینتالیس منٹ کے تین دور رکھے گئے تھے جن میں بیس بیس منٹ نیٹو کے اہلکاروں نے وفد کو بریفنگ دی، جب کہ باقی وقت میں سوال و جواب کا سلسلہ ہوا۔ مولانا فضل الرحمن نے کہا کہ یہ ملاقاتیں ایک دوسرے کا تسلسل تھیں........انہوں نے بتایا کہ نیٹو افغانستان سے 2014تک اپنی افواج نکالنے کے لئے بات کر رہا ہے مگر مولانا کے مطابق نیٹو کا اس طرح اچانک نکلنا بھی مناسب نہیں ہو گا اور انہیں اس خطے کو اکیلا نہیں چھوڑ کر جانا چاہیے"۔

http://ummatpublication.com/2011/04/21/news.php?p=news-19.gif

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

ان دونوں جماعتوں کا یہ موٴقف ہو سکتا ہے کہ صوبہ سرحد کی حد تک ہم شریعت نافذ کر سکتے تھے لیکن اس راہ میں رکاوٹ دستوری و آئینی طور پر یہ تھی کہ صوبے میں کسی بھی قانون کے نفاذ کے لئے گورنر کی منظوری ضروری تھی لہذا بارہا کوشش کرنے کے باوجود گورنر نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

سوال یہ ہے کہ ایک ایسے گورنر سے شرعی قوانین کی منظوری کی امید کیوں لگائی گئی جو کہ اسی خبیث شخص کے تابع تھا جس نے امارت اسلامیہ افغانستان کا سقوط کروایا اور دوسری بات یہ کہ اس آئین و دستور کی کیا شرعی حیثیت ہو گی جس کے بے معنی تقاضوں کو پورا کئے بغیر شریعت کا نفاذ ممکن نہ ہو سکتا ہو اور ان لوگوں کا بھی شرعی حکم کیا ہو گا جو کہ شریعت کے نفاذ کو ایسے آئین و دستور کا پابند سمجھتے ہوں؟

(iv)سانحہ لال مسجد کے موقع پر مجرمانہ کردار:

اسی طرح جب اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے پاکستان کے دار الحکومت اسلام آباد میں سات مساجد کے شہید اور دیگر کو گرانے کے آرڈر جاری ہونے کے نتیجے میں ،لال مسجد اور جامعہ حفصہ سے ''شریعت یا شہادت'' کے عنوان سے کھڑی ہونے والی تحریک کو ختم کرنے کے لئے شروع ہونے والے دس روزہ ''آپریشن سائلنس'' کے دوران دینی جماعتوں ،خاص کر ملک کی سب سے بڑی دینی جماعتیں ،جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام کا کردار انتہائی مجرمانہ تھا۔

معاملہ یہ تھا کہ ایک طرف لال مسجد و جامعہ حفصہ میں قال اللہ و قال الرسول پڑھنے والے معصوم طلباء وطالبات کا پانی تک بند کر دیا گیا تھا اور ان پر آتش و آہن کی برسات ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان دونوں جماعتوں کے قائدین ان سب کو بے یار و مدگار چھوڑ کر اس شخص کی بحالی کے نام پر لندن کی طرف کوچ کر گئے تھے جو کہ پاکستان کے کفریہ و طاغوتی نظام عدالت کا چیف جسٹس تھا ،جس کو اگر ''چیف جسٹس آف طاغوت'' کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

اور نفاذ شریعت کی آواز اٹھانے والوں سے لاتعلقی اور بیزاری کا یہ عالم تھا کہ لندن روانہ ہوتے وقت ائیر پورٹ پر قائدِ جمعیت لال مسجد والوں کو یہ مشورہ دے گئے کہ:

''لال مسجد والوں کو چاہیے کہ وہ حکومت کے سامنے ہتھیار ڈال دیں''۔

یعنی ایک طرف جس خبیث پرویز کے اقتدار کو مختلف بہانوں سے خود دوام بخشا تو دوسری طرف جس نے اس خبیث کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ ہتھیار ڈال دے!

اور خود اس طاغوتی نظام کی بحالی کے لئے لندن روانہ ہو گئے جس کے انہدام کا حکم مسلمانوں کو رب ذوالجلال نے دیا تھا! غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امام عبد الرشید غازی رحمہ اللہ نے اپنی شہادت سے کچھ دیر پہلے ایک نجی ٹی وی چینل Geo News سے بات کرتے ہوئے آخر یہ کیوں کہا تھا کہ:

''میں اس وقت ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اس مسئلہ میں کچھ سیاسی حضرات نے، ''سیاسی علماء'' نے اچھا کردار ادا نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انشاء اللہ ان سے پوچھے گا''

ایک اور نجی ٹی وی چینل Aaj News سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ علماء یعنی ''سیاسی علماء'' نے انتہائی عجیب انداز سے اس مسئلہ کو ڈیل کیا ہے جیسے کہ ہمیں مروانا چاہتے ہوں''۔

(v) نفاذ شریعت کی تحریک کی مخالفت:

اسی طرح جب سانحۂ لال مسجد کے بعد جب صوبہ سرحد خاص کر سوات میں لال مسجد کے خون کا قصاص اور نفاذِ شریعت کی تحریک زور پکڑی تو اس وقت جمعیت اور جماعت سمیت تقریباً تمام دینی جماعتوں نے مخالفت میں جس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک نامی گرامی رافضی ''مسٹر ٹین پرسن'' (جو کہ آج صدر پاکستان کے عہدے پر فائز ہے) کی حکومت کو سپورٹ کیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی تاریخ میں سب سے بڑی ہجرت سوات و مالاکنڈ کے لوگوں نے کی، کہ ان کو اپنے ہی ملک میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں دربدر ہونا پڑا اور اگر لوگوں کا حافظہ قوی ہو تو ان کو یاد ہو گا کہ جب سوات کو نفاذِ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں سے چھین لیا گیا تو اس فتح کا جشن منانے کے لئے امریکی جنرل سمیت دنیا بھر کے فوجی عہدے دار اور سفار تکار وقتاً فوقتاً سوات آتے رہے۔

صرف سوات ہی نہیں، یہ کہانی باجوڑ سے لے کر مہمند و اور کزئی ایجنسی تک اور شمالی وزیرستان سے لے کر جنوبی وزیرستان تک پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے ہی لوگوں کے خلاف پاکستان کی فضائیہ نے اپنی تاریخ کا سب سے بڑا فضائی آپریشن کیا جس میں اس نے دس ہزار بم گرائے اور ہزاروں لوگوں کو تہہ تیغ

کیا اور ہزاروں کو مضروب، کھیت کھلیانوں کو اجاڑ دیا گیا، مال و املاک کو برباد کر دیا گیا حتیٰ کہ قوم کی بیٹیاں جو کہ اس دربدری میں اپنے خاندانوں سے چھوٹ گئیں تھیں، ان کو یورپ اور امریکہ کے نائٹ کلبوں کے لئے فروخت کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا لیکن دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم سوتے رہے!

اس کے علاوہ اور دیگر امور بھی ہیں جو کہ قائد جمعیت اور اس کے دیگر رہنماؤں کے ذاتی کردار و اخلاق سے متعلق ہیں کہ جن کی بنیاد پر کوئی بھی شخص کسی دینی جماعت کے امیر کی حیثیت سے قائم نہیں رہ سکتا مگر ان کا تفصیلی ذکر یہاں کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ جمعیت سے تعلق رکھنے والے لوگ اس بات سے بخوبی آگاہ بھی ہیں۔

ماضی کے آئینے میں موجودہ صورتحال:

یہ ہیں وہ احوال اور اس پر جمعیت کا مجموعی کردار، اور آج صورتحال یہ ہے کہ ان تمام سابقہ قباحتوں کے باوجود آج بھی قائدِ جمعیت اُسی رافضی کمیشن ایجنٹ کی حکومت کی قائم کردہ ''کشمیر کمیٹی'' کے چیئرمین بنے ہوئے ہیں اور ان کو وفاقی وزیر کا درجہ حاصل ہے، جس کی رافضی بیوی نے اپنے دور حکومت میں سب سے پہلے مسئلہ کشمیر کو حکومتی سطح پر سمندر برد کرنے کا آغاز کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی جمعیت علماء اسلام بحیثیت مجموعی اسی نااہل اور رافضی شخص کی حکومت کے ساتھ کھڑی ہے اور اس حکومت کا چار ساڑھے سال کا عرصہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس رافضی شخص کی حکومت کے ہر مشکل وقت میں جمعیت نے دامے، درمے، سخنے بھرپور ساتھ دیا، جس کا سلسلہ تاحال جاری وساری ہے۔ گویا بقول:

جان و دل نثار ہے آج اک لعین پر
المیہ ہی المیہ پاک سرزمین پر

سوال یہ ہے کہ شریعت میں اس شخص کی نہ صرف امارت قبول کرنے بلکہ اس کا وزیر بننے کا کوئی جواز ہے جو کہ ایک طرف رافضی ہو اور دوسری طرف اس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود ونصاریٰ کی نہ صرف مدد ونصرت کی بلکہ ان کو ہر طرح کی چھوٹ عطا کر دی ہو کہ وہ ملک میں جو چاہے کرتے پھریں، کوئی ان کو روکنے والا نہیں، جس کے نتیجے میں پاکستان بلیک واٹر جیسی تنظیموں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ گویا کہ جس مقصد کے لئے جمعیت کا قیام عمل میں آیا تھا، آج جمعیت بالکل اس کے برخلاف کام کر رہی ہے مگر جمعیت کے اہل علم اب بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ اللہ رب العزت نے جو اقامت دین کا فریضہ بدرجہ اولیٰ ان پر عائد کیا تھا وہ جمعیت کی صورت میں پورا ہو رہا ہے حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے!! سوال یہ ہے کہ ایسے رافضی شخص کی امارت میں وزیر بننے والوں کا اور ان کی ہر لحاظ سے مدد ونصرت کرنے والوں کا شرعی حکم کیا ہے؟؟

خلاصہ کلام:

پاکستان میں اقامت دین کے عنوان سے اٹھنی والی مذکورہ تینوں جماعتوں کے مقصدِ قیام اور ان کے طریق کار کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ان جماعتوں کے مقصدِ قیام اور ان کے طریق کار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی گندم کے حصول کے لئے جو بوئے اور یہ چاہے کہ اس سے گندم حاصل ہو۔ اسی طرح ان جماعتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ چاہتے تو اسلامی انقلاب اور شریعت کا نفاذ ہیں لیکن اس کے لئے طریق کار وہ (جمہوری و آئینی) استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ جو کہ اللہ رب العزت نے اس کام کے لئے شرعی طور پر مقرر ہی نہیں کئے۔

ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ وہی نکلا کہ (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) کہ مسلم ممالک میں اسلامی انقلاب اور شریعت کا نفاذ تو دور کی بات، یہ جماعتیں مسلم ممالک میں چاروناچار مغربی اقدار وافکار اور اس کے سیاسی نظام کی ترویج ونفاذ کا ذریعہ بن گئیں۔ نتیجتاً آج پورے عالم اسلام پر ان طواغیت کی حکمرانی ہے جنہوں نے ایسے آئین ودستور وضع کر لئے ہیں جن کے ذریعے وہ ایک طرف تحکیم بغیر

ماانزل اللہ جیسے کفرِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کے مکمل اعوان و انصار بنے ہوئے ہیں جس کا نتیجہ مسلمانوں کی تباہی کی صورت میں نکل رہا ہے۔ جہاں تک رہا ان جماعتوں کا تعلق، تو اس پورے عرصے میں سوائے ملکی آئین و دستور کی پابندی کے سوا ان کا کردار اور کچھ بھی نہیں ہے۔

اصل مسئلہ کیا ہے؟
شرعی احکامات کو آپس میں خلط ملط کرنا

سب سے قابلِ غور بات یہ ہے کہ امت مسلمہ میں عصر حاضر کی وہ جماعتیں جو کہ اسلامی انقلاب یا اقامتِ دین کے لئے کھڑی ہوتی ہیں، اور ان میں سے اکثر کی بنیاد بڑے خلوص و اخلاص کے ساتھ رکھی جاتی ہے لیکن وہ کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے وہ ایسا طریقہ کار اختیار کر بیٹھتی ہیں جو کہ اسلامی انقلاب یا اقامتِ دین میں معاون ہونے کے بجائے اُلٹا اس میں رکاوٹ کا باعث بن جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ان تمام وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو اصل مسئلہ ایک ہی نظر آتا ہے، وہ ہے:

"شرعی احکامات کو آپس میں خلط ملط کرنا"۔

اس ضمن میں سب سے بنیادی مسئلہ جس میں شرعی احکامات کو خلط ملط کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان دو افراد کے درمیان فرق نہ کرنا جن میں سے ایک فسق و معصیت پر مبنی اپنے قول و عمل کی وجہ سے از روئے شریعت "فاسق اور گناہ گار" ٹھہرے اور دوسرا کفر و ارتداد پر مبنی افعال و اقوال کی وجہ سے "کافر اور مرتد" قرار پائے۔

جو شخص علمِ شرعی کی تھوڑی سی بھی شدبد رکھتا ہو، وہ یہ بات جانتا ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک شریعت نے جس قول و فعل کو "فسق اور معصیت" سے تعبیر کیا ہے تو اس کا مرتکب بھی "فاسق اور گناہ گار" ٹھہرتا ہے، اس سے اس کا کفر واجب نہیں آتا جس کی وجہ سے اس کا مال و جان دوسرے

مسلمانوں کے لئے حلال ہو جائے، جیسا کہ خوارج نے فسق و معصیت کی بنیاد پر مسلمانوں کی تکفیر کی اور گمراہ ہو گئے۔ اسی طرح وہ قول و فعل جس کو شریعت نے واضح "کفر اور ارتداد" قرار دیا ہے اور اس کی وجہ سے اس شخص کے مال و جان کو حلال کر دیا ہے۔ تو ایسے شخص کو مسلمان سمجھنا دین اسلام کی عمارت کو ڈھا دینے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ یہ کام "مرجئہ" نے کیا اور گمراہ ہو گئے، کہ انہوں نے ہر اس شخص کو مسلمان قرار دیا جو کہ کفر و ارتداد پر مبنی اقوال و افعال کا مرتکب ہونے کے باوجود بس زبان سے اس کے اعتقاد رکھنے کا اعلان نہ کرے۔ چنانچہ خوارج اور مرجئہ میں ایک ہی مشترک بیماری تھی کہ انہوں نے شرعی احکامات کو آپس میں خلط ملط کر دیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ خوارج نے کافر کا حکم مسلمان پر لگا دیا تھا اور مرجئہ نے مسلمان کا حکم کافر پر لگا دیا تھا۔

چنانچہ آج فسق و معصیت اور اس کے برعکس کفر و ارتداد کے مرتکب شخص کے حکم میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے اقامت دین یا شریعت کے نفاذ کے لئے کھڑی ہونے والی جماعتیں ایسے مسائل میں گھر جاتی ہیں جس سے نکلنے کا بہر حال کوئی راستہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ ان دونوں افراد سے متعلق شرعی احکامات کا لحاظ کریں۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے لازماً ایسا طریق کار اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں جس کا سرے سے نہ کوئی شرعی وجود ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی شریعت اجازت دے سکتی ہے۔

نتیجتاً اہم شرعی مسائل و احکام میں ان جماعتوں کے نظریات واضح طور پر شریعت کے خلاف ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے فکر و عقیدے پر بہت ہی سنگین نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں اگر ہم ان مسائل کا جائزہ لیں تو ان میں سے چیدہ چیدہ درج ذیل ہیں:

(۱) ظلم و فسق اور کفر و ارتداد کے ساتھ حکومت کرنے والوں کے درمیان فرق نہ کرنا۔
(۲) دارالاسلام اور دارالحرب کے احکامات کو خلط ملط کر دینا۔
(۳) مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کی مدد و نصرت کرنے والوں کو مسلمان سمجھنا۔
(۴) الحکم بغیر ما انزل اللہ کے حکومت کرنے والے طواغیت کو مسلمان سمجھنا۔

چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مذکورہ بالا امور سے متعلق شرعی احکامات کو مختصراً جان لیا جائے تاکہ ان جماعتوں کے طریق کار میں پائے جانے والے تضادات کی درست نشاندہی ہو سکے اور دوسری طرف ان جماعتوں کے متعلقین شرعی احکامات کی روشنی میں اپنی جماعتوں کی اصلاح کر سکیں تاکہ ان جماعتوں کی تمام کوششوں کا محور وہ طریق کار ہو جائے جسے شریعت نے قیامت تک کے لئے اقامت دین یا شریعت کے نفاذ کے لئے مقرر کیا ہے۔

پہلا مسئلہ

ظالم وفاسق اور کافر ومرتد حاکم کے درمیان فرق نہ کرنا

اول تو اقامت دین کے لئے کھڑی ہونے والی اکثر جماعتیں اس مسئلہ کا تعین ہی نہیں کرتی کہ جدھر وہ نفاذ اسلام چاہتی ہیں ادھر حکومت کرنے والے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا وہ امام عادل ہے یا صرف ظالم و فاسق یا پھر اس کا حکم اس سے بڑھ کر کافر ومرتد کا ہو گیا ہے۔اور اگر کوئی اس کو بیان کرنے کی حاجت بھی محسوس کرتا ہے تو وہ اس معاملے میں احکامات کو خلط ملط کر دیتا ہے۔کوئی مسلمانوں پر حکومت کرنے والے ہر حکمران کو خلیفہ سمجھتے ہوئے اس پر ''امام عادل'' کے احکامات لاگو کر دیتا ہے تو کوئی کفر وارتداد کی بنیاد پر کافر ومرتد ہو جانے والے حکمرانوں کو صرف ظالم وفاسق حکمران کہہ کر ان پر ظلم وفسق کے ساتھ حکومت کے کرنے والے حاکم کے احکامات لاگو کر رہا ہوتا ہے۔

جیسا کہ مذکورہ تینوں جماعتوں کا معاملہ ہے کہ ان میں سے جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام کے نزدیک یہ مسئلہ توشاید کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا کہ حکومت کرنے والا آیا امام عادل ہے یا وہ ظلم وفسق کے ساتھ حکومت کر رہا ہے یا پھر وہ اپنے کفر و ارتداد کی بناء پر کافر ومرتد ہو چکا ہے اور اس کی اطاعت ساقط ہو چکی ہے۔جہاں تک تنظیم اسلامی کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں پر مسلط حکمرانوں کے تمام تر کفر کے باوجود ان کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کہتے ہیں:

> ''صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم و نافذ نہ ہو بلکہ پورے کا پورا ''لادینی''(Secular) نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران ''مسلمان'' ہی تسلیم کئے جائیں گے''۔(منہج انقلاب نبوی،ص336)

یعنی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جو حاکم اللہ کی نازل کردہ شریعت کے بجائے کفریہ و شرکیہ نظامِ قانون نافذ کرے ،اس کے باوجود ایسے حاکم کو بہر حال مسلمان ہی تسلیم کیا جائے گا۔جیسا کہ وہ افغانستان پر روسی جارحیت کے بعد روس نواز حکمران کارمل کو بھی مسلمان سمجھتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسی طرح کا مسئلہ افغانستان میں ہو رہا ہے یا نہیں ؟کارمل بظاہر مسلمان ہے۔آج تک نہیں سنا گیا کہ اس کی تکفیر کی گئی ہو۔اس کے ساتھ جو افغانی فوج ہے ،وہ سب کے سب بہر حال مسلمان ہیں''۔(منہج انقلاب نبوی،ص345)

اسی طرح وہ اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ کہنے والی بینظیر بھٹو کو اور دوسری طرف مشرف جیسے خبیث کافر کو بھی مسلمان سمجھتے ہیں:

''ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں ،ہیں تو مسلمان۔بھٹو ،بینظیر ،ضیاء الحق ،نواز شریف اور پرویز مشرف سب مسلمان ہیں''۔(رسول انقلاب کا طریق انقلاب،ص58)

اور پھر زیادہ سے زیادہ کفر و ارتداد کے مرتکب ان حکمرانوں کو مسلمان سمجھتے ہوئے ان پر وہ ظلم و فسق کے ساتھ حکومت کرنے والے کا حکم لگا دیتے ہیں:

''ہمارے اس ملک میں بسنے والے سنی مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی المسلک ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مؤقف یہی ہے کہ فاسق و فاجر مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج ہو سکتا ہے۔البتہ اس کے لئے بڑی کڑی شرائط ہیں''۔(منہج انقلاب نبوی،ص343)

اسی طرح ڈاکٹر صاحب ایسے حکمران پر جو کہ شریعت کے کسی واضح حرام کردہ چیز یا گناہ کی ترغیب و تشویق کے ساتھ اس کی ترویج بھی کر رہا ہو اس کے خلاف خروج کے وہی شرائط عائد کرتے ہیں جو کہ ظالم ہو یا ذاتی حیثیت میں کسی گناہ یا فسق میں مبتلا حاکم کے خلاف خروج کے شرائط ہیں۔یعنی ذاتی حیثیت

میں گناہ گار یا ظالم اور اور اس کے برعکس کسی بھی واضح حرام شے کی ترغیب و تشویق اور اس کے ترویج کرنے والے حاکم کے درمیان ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی فرق نہیں:

ایک شرط تو یہ ہے کہ حکمرانوں کی طرف سے کھلم کھلا اور برملا کسی ایسی بات کا ظہور ہو رہا ہو جو خلاف اسلام ہے۔ مثلاً کوئی شخص شراب پی رہاہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن اگر وہ شراب نوشی کی ترویج کر رہا ہو، لوگوں کو اس کے استعمال کی ترغیب و تشویق دے رہا ہو تو معاملہ مختلف ہو جائے گا۔ ایسے حکمران کو معزول کرنے کے لئے قوت فراہم کرنا اور خروج کرنا بالکل جائز اقدام ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے جو لوگ اٹھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ وہ یقین رکھتے ہوں کہ ہم تبدیلی برپا کر دیں گے۔ یہ نہیں کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیں، جس کا نتیجہ بدامنی کی صورت میں ظاہر ہو اور وہ لوگ ختم ہو کر رہ جائیں ....تو یہ اس مسئلہ کی خالص دینی اور شرعی حیثیت"۔(منہج انقلاب نبوی، ص343)

یہ ہیں وہ موٴقف جو کہ تنظیم ظلم و فسق اور اس کے برعکس کفر وارتداد کے ساتھ حکومت کرنے والے حکمرانوں کے بارے میں رکھتی ہے اور اگر جماعت اسلامی یا جمعیت علمائے اسلام کی جانب سے اس حوالے سے کوئی موٴقف کبھی کبھار سامنے آ بھی جاتا ہے تو وہ اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی باتیں اور دلائل اس میں بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم امام عادل کے شرعی حکم کو جانیں اور ساتھ ساتھ ظلم و فسق یا کفر وارتداد کے ساتھ حکومت کرنے والے کے شرعی حکم کو بھی جانیں۔

امام عادل.........امت مسلمہ کے لئے عظیم نعمت:

امام عادل امت مسلمہ کے لئے کسی نعمت کبریٰ سے کم نہیں اور اس نعمت کا کوئی نعم البدل بھی نہیں۔ شریعت کی روشنی میں عادل حکمران وہ ہوتا ہے جو کہ خلقِ خدا کے ساتھ رحمت اور شفقت سے پیش آئے اور ان پر اللہ کی نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرے اور حدودِ شرعیہ کا مکمل نفاذ کرے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان الامة واجب عليها الانقياد لامام عادل يقيم فيهم احكام الله ويسوسهم باحكام الشريعة التى اتىٰ بها رسول الله''۔(غیاثی ص:183)

'' امت پر عادل خلیفہ کی فرمانبرداری لازم ہے جو ان میں احکام الٰہی کو قائم کرتا ہے اور احکام شریعت جو رسول اللہ لائے ہیں، ان کے نفاذ کا انتظام کرتا ہے''۔

چنانچہ ایسے امام عادل کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَوْمٌ مِنْ إِمَامٍ عَادِلٍ أَفْضَلُ مِنْ عُبَادَةِ سِتِّينَ سَنَةً، وَحَدٌّ يُقَامُ فِي الْأَرْضِ بِحَقِّهِ أَزْكَى فِيهَا مِنْ مَطَرٍ أَرْبَعِينَ عَامًا))(الطبرانى فى الكير والاوسط، مجمع الزوائدج:5ص:197، وفيه سعد ابو غيلان الشيبانى ولم اعرفه وبقية رجاله ثقات)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام عادل کا ایک دن افضل ہے ستر سال کی عبادت سے اور زمین پر ایک حد کا قیام چالیس سالوں کی بارش سے زیادہ خوشحالی کا باعث ہے''۔

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ إِمَامٌ عَادِلٌ))(صحيح البخارى ج21ص74 رقم الحديث:6308)

”حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا: سات اشخاص قیامت کے دن اللہ کے سایہ میں ہوں گے جس دن کوئی سایہ نہ ہو گا اس کے سوا........ان میں سے ایک امام عادل ہے“۔

((عن عمر بن الخطاب قال قال رسول اللّٰہ ان افضل عباداللّٰہ منزلہ یوم القیمۃ امام عادل رفیق))(شعب الایمان ج:6ص16،رقم الحدیث 7371)

”حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک قیامت کے دن اللہ کے بندوں میں درجے کے اعتبار سے افضل نرم دل امام عادل ہو گا“۔

((عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَة وَأَقْرَبَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا إِمَامٌ عَادِلٌ))

(مسند احمد،ج:3ص:22،رقم الحدیث 11190)

”حضرت ابی سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور مجلس میں اس کے زیادہ قریب عادل حکمران ہوں گے“۔

((ثلاث لایرد لھم دعوۃ الصائم حتی یفطر وامام عادل ودعوۃالمظلوم))

(مسند اسحاق بن راھویہ ج:1ص:317،رقم الحدیث 300،عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ)

”تین آدمیوں کی دعاء رد نہیں ہوتی روزے دار یہاں تک وہ افطار کرلے اور امام عادل کی اور مظلوم کی دعا“۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ شریعت کا بلا کسی شرکت غیرے مکمل نفاذ ہی دراصل اس بات کی علامت ہے کہ حکومت کرنے والا امام عادل ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف کسی بھی صورت میں خروج حرام ہے اور اس کی مکمل اطاعت و فرمابرداری کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

اس کے برعکس اگر ایک حاکم ظلم و فسق کے ساتھ اور دوسرا کفر و ارتداد کے ساتھ حکومت کر رہا ہے تو دونوں کے احکامات میں زمین و آسمان جیسا فرق ہے۔اسی لحاظ سے ان دونوں قسم کے حکمرانوں کی تبدیلی کا بھی شریعت نے الگ الگ طریقہ کار مقرر کیا ہے۔ جس کا جاننا انتہائی ضروری ہے۔

ظلم و فسق کے ساتھ حکومت کرنے والے کا شرعی حکم:

ظلم و فسق کے ساتھ حکومت کرنے والے مسلم حکمران کو اگرچہ شریعت نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا مگر اس کی امامت کو بہر حال جائز تسلیم کیا ہے اور اس کی اطاعت کو معصیت کے علاوہ لازم قرار دیا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے

((أَلَا مَنْ وَلِيَ عَلَيْهِ وَالٍ فَرَآهُ يَأْتِي شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللَّهِ فَلْيَكْرَهْ مَا يَأْتِي مِنْ مَعْصِيَةِ اللَّهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ))(صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، رقم:4768)

”جان لو کہ جس شخص پر کوئی حکمران بنا ہو، پھر وہ اس کو کسی ”معصیت“ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے تو جس معصیت کا وہ ارتکاب کر رہا ہے، اُسے برا سمجھے لیکن اطاعت سے ہرگز ہاتھ نہ کھینچے“۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حکمرانوں کی اطاعت سے بھی ہاتھ کھینچنے سے منع کیا ہے جو کہ اپنا حق تو لے لیتے ہوں اور دوسروں کا حق نہ دیتے ہوں، یعنی ظلم کے ساتھ حکومت کر رہے ہوں۔

لیکن اگر کوئی حاکم کے ظلم و فسق کی بنیاد پر اس کے خلاف خروج کرے تو اس کو بھی حرام نہیں ٹھہرایا گیا مگر یہ کہ اس خروج کے لئے کچھ شرائط عائد کر دی گئیں (جن کی تفصیل آگے آئے گی)۔ یہی وجہ ہے کہ فاسق امام اور خاص کر ظالم امام جس کو احادیث مبارکہ میں "امام جائر" کہا گیا ہے، اس کو قابل اطاعت ہونے کے باوجود اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا بلکہ اس پر آخرت کے حوالے سے شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام جائر یعنی ظالم حکمران کے بارے میں فرمایا:

((اِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ فَإِيَّاكَ أَنْ تَكُونَ مِنْهُمْ))

(صحیح البخاری ومسلم، رواہ البزار، مجمع الزوائد ج:5 ص:239)

"بدترین حاکم رعایا پر "ظلم" کرنے والے ہیں، پس تم اس بات سے بچو کہ تم ان میں سے ہو"۔

((وَإِنَّ أَبْغَضَ النَّاسِ إِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَشَدَّهُ عَذَابًا إِمَامٌ جَائِرٌ))

(مسند احمد، ج:3 ص:22، رقم الحدیث 11190)

"بے شک "ظالم" حکمران قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور اس کے شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا"۔

((مَا مِنْ أَمِيرٍ يَلِي أَمْرَ الْمُسْلِمِينَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ إِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ))

(صحیح مسلم، ج1 ص345 رقم الحدیث:205)

"جو بھی شخص مسلمانوں کا حکمران بنتا ہے ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور ان کے ساتھ خیر خواہی نہیں کرتا تو وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہو گا"۔

((مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ إِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ))(صحیح مسلم، ج1 ص343 رقم الحدیث:203)

"اللہ جب کسی کو لوگوں پر حکمران بنا دیتا ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہو تو مرنے کے بعد اللہ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔"

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ظلم واستبداد کے ساتھ حکومت کرنے والے کے بارے میں یہ ارشادات ہیں تو کفر وارتداد کے ساتھ حکومت کرنے والے کے بارے میں کیا حکم ہو گا؟

ظالم وفاسق حکمران اور سلف وصالحین کا ذاتی طرز عمل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمومی طور پر حکمرانوں سے میل جول اور ان کے دروازوں پر جانے سے منع کیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((وَمَنْ أَتَى أَبْوَابَ السُّلْطَانِ افْتَتَنَ))(سنن الترمذی،ج8ص211 رقم:2182)

"جو حکمرانوں کے دروازوں پر حاضر ہو گا وہ فتنے میں مبتلاء ہو جائے گا"

اور فرمایا:

((وَمَا ازْدَادَ عَبْدٌ مِنْ السُّلْطَانِ دُنُوًّا إِلَّا ازْدَادَ مِنْ اللَّهِ بُعْدًا))(سنن ابی داود،ج8ص43رقم:2476)

"اور جتنا کوئی شخص حاکم کا قرب اختیار کرے گا اتنا ہی وہ اللہ سے دور ہوتا جائے گا"۔

یہی وجہ ہے کہ سلف وصالحین ظالم وفاسق حکمران سے بہت زیادہ غنائیت اور بے اعتنائی برتتے تھے اور ایسے حاکم کے دروازوں کے چکر لگانے اور ان کے درباروں میں حاضر ہونے اور ان کے ساتھ نشست وبرخاست سے ہر ممکن بچتے تھے۔امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان دعوك لتقرا عليهم :قل هو الله احد ،فلاتأتهم'' (بیہقی)

''اگر (ظالم) حکمران تمہیں اس لئے بلائیں کہ تم انہیں ﴿قل ھو اللہ احد﴾ پڑھ کر سناؤ تو پھر بھی نہ جانا''۔

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''ان فجار القراء اتخذوا الی الدنیا فقالوا: ندخل علی الأمراء نفرج عن مکروب ونکلم فی محبوس''

''فاجر علماء نے دنیا تک (رسائی کے لئے) ایک بہانہ ڈھونڈ لیا ہے اور کہتے ہیں: ہم حکمرانوں کے یہاں جائیں گے تاکہ کسی مصیبت زدہ کو نجات دلائیں اور کسی قیدی کی سفارش کریں''۔

سوچنے کا مقام ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے اسلاف نے ظالم حکمرانوں کے پاس جانے سے علماء دین کو منع فرمایا ہے تو کیا اللہ اور اس کا رسول اس بات سے راضی ہوں گے کہ علماء کفر وارتداد کے مرتکب حکمرانوں سے میل جول رکھیں، ان کے ظلم پر خاموش رہیں اور ان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے بجائے ان کی حکومتوں کے وزیر و مشیر بن جائیں اور ان کی حکمرانی کا دم بھرنا شروع کر دیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ظالم حکمران'' کیلئے یہ حکم جاری فرمایا تھا:

((عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکون فی آخر زمان امراء ظلمۃ ووزراء فسقۃ وقاضۃ خونۃ وفقھاء کذبۃ فمن ادرك ذلك الزمان منکم فلا یکون لھم جابیا ولا عریفا ولا شرطیا))

(الطبرانی فی الصغیر والأوسط، مجمع الزوائد ج:5، ص:233، قال معاویہ بن الھیثم لم اعرفہ وبقیۃ رجالہ ثقات)

''حضرت ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخری زمانے میں ایسے حکمران آئیں گے جو ظالم ہوں گے اور ان کے وزراء فاسق ہوں گے اور

قاضی خائن ہوں گے اور ان کے علماء ''جھوٹے'' ہوں گے۔ سو تم میں سے جو ایسا وقت پائے وہ ہرگز کوئی ناظم یا سپاہی یا محصولات وصول کرنے والا نہ بنے''۔

((وعن ابي سعيدرضی الله عنه وابي هريرةرضی الله عنه قالا قال رسول الله ليأتين على الناس زمان يكون عليهم امراء سفهاء يقدمون شرارالناس ويظهرون بخيارهم ويؤخرون الصلاةعن مواقيتها فمن ادرك ذلك منكم فلايكونن عريفاولاشرطيا ولاجابيا ولاخازنا)) (مسند ابي يعلى، مجمع الزوائدج:5ص:240)

''حضرت ابی سعید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان کے حکمران بیوقوف ہوں گے وہ بدترین لوگوں کو اپنے قریب کریں گے اور وہ نمازوں کو اس کے اوقات سے مؤخر کریں گے۔ سو تم میں سے جو ایسا وقت پائے وہ ہرگز کوئی ناظم یا سپاہی یا محصولات وصول کرنے والا یا خزانچی نہ بنے''۔

((عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ سَيَكُونُ أُمَرَاءُ يَغْشَاهُمْ غَوَاشٍ أَوْ حَوَاشٍ مِنْ النَّاسِ يَظْلِمُونَ وَيَكْذِبُونَ فَمَنْ أَعَانَهُمْ عَلَى ظُلْمِهِمْ وَصَدَّقَهُمْ بِكَذِبِهِمْ فَلَيْسَ مِنِّي وَلَا أَنَا مِنْهُ وَمَنْ لَمْ يُصَدِّقْهُمْ بِكَذِبِهِمْ وَلَمْ يُعِنْهُمْ عَلَى ظُلْمِهِمْ فَأَنَا مِنْهُ وَهُوَ مِنِّي))(مسند احمد وابو يعلى، مجمع الزوائد، ج:5ص:246)

''حضرت ابی سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آئندہ ایسے حکمران ہوں گے جن کے ارد گرد حاشیہ بردار اور حاضر باش لوگ منڈلاتے رہیں گے، جھوٹ بولیں گے اور ظلم کریں گے۔ جو کوئی ان کے پاس گیا اور ان کے جھوٹ کی تصدیق کی اور ان کے ظلم میں معاونت کی تو نہ مجھ سے ہے اور نہ میں اس سے ہوں اور

جو نہ گیا ان کے پاس اور نہ ان کے جھوٹ کی تصدیق کی اور نہ ان کے ظلم میں ان کی معاونت کی تو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں"۔

حاصل کلام یہ ہے کہ شریعت نے ظلم وفسق کے ساتھ حکمران کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینے سے تو منع فرمایاہے مگر حکمران کی معصیت اور ظلم میں معاونت کرنے سے والے سے اظہارِ بیزاری کیا۔

ظالم وفاسق حکمران کو بدلنے کا شرعی طریقہ:

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حاکم کے ظلم وفسق کی بنیاد پر اس کے خلاف کوئی خروج کرے تو اس کو بھی حرام نہیں ٹھہرایا گیا مگر یہ کہ اس خروج کے لئے کچھ شرائط عائد کر دی گئیں۔

اگرچہ اسلاف میں سے کچھ فقہاء بعض احادیث کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں خلیفہ وہ ہی ہوتا ہے جو کہ عادل ہو اور ظلم وفسق سے نجات دلانے والا ہو لہٰذا اگر وہ ان مقاصد کو پورا کرنے میں ناکام رہے تو اس کو وہ فوراً تبدیل کرنے اور اس کے جگہ دوسرے خلیفہ کو مقرر کرنے کو وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿لَا یَنَالُ عَهْدِ الظّٰلِمِیْنَ﴾ "میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا"۔ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قال ابن خویز منداد: وکل من کان ظالما لم یکن نبیا ولا خلیفة ولا حاکما ولا مفتیا، ولا امام صلاة، ولا یقبل عنه ما یرویه عن صاحب الشریعة، ولا تقبل شهادته فی الاحکام، غیر أنه لا یعزل بفسقه حتی یعزله أهل الحل والعقد." (تفسیر القرطبی ج2ص109)

"ابن خویز منداد رحمہ اللہ نے کہاہے جو بھی " ظالم " ہوتا ہے وہ نہ نبی بنتا ہے، نہ خلیفہ، نہ حاکم، نہ مفتی، نہ نماز کے امام، نہ اس کی روایت قبول کی جاتی ہے، نہ احکام میں اس کی گواہی

قبول کی جاتی ہے، جب تک اپنے فسق کی وجہ سے معزول نہ کر دیا جائے اور اہل حل وعقد اس کو معزول کر دیں"۔

امام قرطبی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

"الامام اذا نصب ثم فسق بعد انبرام العقد فقال الجمهور: انه تنفسخ امامته ويخلع بالفسق الظاهر المعلوم ، لانه قد ثبت أن الامام انما يقام لاقامة الحدود واستيفاء الحقوق وحفظ أموال الايتام والمجانين والنظر فی أمورهم الى غير ذلك مما تقدم ذكره، وما فيه من الفسق يقعده عن القيام بهذه الامور والنهوض بها۔ فلو جوزنا أن يكون فاسقا أدى الى ابطال ما أقيم لاجله، ألا ترى فی الابتداء انما لم يجز أن يعقد للفاسق لاجل أنه يؤدى اليابطال ما أقيم له، وكذلك هذا مثله۔" (تفسیر القرطبی ج 1ص271)

"جب امام کا تقرر ہو جائے اور اس کے بعد وہ فسق کرے تو جمہور کہتے ہیں اس کی امامت فسخ ہو جائے گی اس کو ہٹا کر کسی اور کو امام بنایا جائے گا اگر اس نے فسق ظاہری اور معلوم کا ارتکاب کیا ہو۔ اس لیے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ امام کا تقرر مقصد کے لیے ہوتا ہے جیسے حدود کا نفاذ اور حقوق کی ادائیگی وتحفظ، یتیموں کے مال کی حفاظت، مجرموں پر نظر رکھنا وغیرہ۔ مگر جب وہ خود فاسق ہو گا تو ان امور کی انجام دہی نہیں کر سکے گا۔ اگر ہم فاسق کے لیے امام برقرار رکھنا جائز قرار دیدیں تو جس مقصد کے لیے امام بنایا جاتا ہے وہ مقصد باطل ہو جائے گا اسی لیے تو ابتداء ہی سے فاسق کا امام کے لیے تقرر جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصد امامت فوت ہو جاتا ہے"۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ظالم حکمران کو اختیارات کے استعمال سے روک لینا چاہیے۔ وہ معزول کیے جانے کے لائق ہے حکمران بنائے جانے کے نہیں“۔(احیاء العلوم:2/111)

مگر اہل سنت والجماعت کے جمہور فقہاء نے خلیفہ کے خلاف جبکہ وہ ظالم و فاسق ہو اور ابھی کسی کفر وارتداد کا ظہور بھی اس سے نہ ہوا ہو تو اس کے خلاف خروج کو اس وقت تک جائز نہیں سمجھا جب تک وہ قوت حاصل نہ ہو جائے جس میں غالب امکان یہ ہو کہ اس خروج کے ذریعے بغیر کسی بڑے خون خرابے کے خلیفہ وقت کو تبدیل کیا جاسکے گا۔ اس شرط کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ اوّل یہ کہ خلافت کی سرحدوں کی وسعت کے لئے اس کی سرحدوں پر مستقل جہاد چل رہا ہوتا تھا، اگر تو بغیر معتدبہ قوت کے مسلح خروج کیا جاتا تو اس سے شدید خانہ جنگی کا خدشہ ہو جاتا جو کہ اسلامی سرحدات پر جاری جہاد پر اثر انداز ہونے اور کفار کے دار الاسلام کے بعض علاقوں پر قبضے کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ دوم یہ کہ ”عمارتِ خلافت“ اپنی جگہ قائم تھی صرف خلیفہ کی ذات میں ظلم و فسق ظاہر ہو جاتا تھا، جو کہ متعدی نہ ہوتا (جس کی وضاحت آگے آئے گی)۔ لہٰذا اگر کسی بڑی خونریزی کا اندیشہ نہ ہو اور معتدبہ طاقت موجود ہو تو اس کے خلاف خروج جائز ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”لا ینخلع الا بالکفر أو بترك اقامة الصلاة أو الترك الی دعائها أو شئ من الشریعة،لقوله علیه السلام فی حدیث عبادة: وألا ننازع الامر أهله الا أن تروا كفرا بواحا عندكم من الله فیه برهان“ (تفسیر القرطبی ج 1ص271)

”کچھ لوگ کہتے ہیں جب تک امام کفر نہ کرے اسے ہٹایا نہیں جائے گا یا نماز ترک نہ کرے یا اور کوئی شریعت کا کام ترک نہ کردے جیسا کہ عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے: الا یہ کہ تم امام میں واضح کفر دیکھ لو جس پر تمہارے پاس دلیل ہو“۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''وَنَقَلَ ابْن التِّين عَنْ الدَّاوُدِيّ قَالَ: الَّذِي عَلَيْهِ الْعُلَمَاء فِي أُمَرَاء الْجَوْر أَنَّهُ إِنْ قَدَرَ عَلَى خَلْعه بِغَيْرِ فِتْنَة وَلَا ظُلْم وَجَبَ، وَإِلَّا فَالْوَاجِب الصَّبْر۔ وَعَنْ بَعْضهمْ لَا يَجُوز عَقْد الْوِلَايَة لِفَاسِقٍ اِبْتِدَاء، فَإِنْ أَحْدَثَ جَوْرًا بَعْدَ أَنْ كَانَ عَدْلًا فَاخْتَلَفُوا فِي جَوَاز الْخُرُوج عَلَيْهِ، وَالصَّحِيح الْمَنْع إِلَّا أَنْ يُكَفِّر فَيُجِبْ الْخُرُوج عَلَيْهِ. (فتح الباری لابن حجر،ج20ص59 رقم:6532)

''ابن التین نے داؤدی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ امراءِ ظلم کے بارے میں علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر بغیر فتنہ اور ظلم کے اس کو ہٹانا ممکن ہو تو ضروری اور واجب ہے ورنہ صبر واجب ہے۔ بعض نے کہا کہ فاسق کو حکومتی عہدہ دینا ہی جائز نہیں ہے اگر عہدہ حاصل کرنے کے بعد ظلم کیا تو اس کے ہٹانے میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ بغاوت سے منع ہے جب تک کہ اس سے واضح کفر صادر نہ ہو''۔

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

''وَأَمَّا قَوْله: (أَفَلَا نُقَاتِلهُمْ؟ قَالَ: لَا، مَا صَلَّوْا) فَفِيهِ مَعْنَى مَا سَبَقَ أَنَّهُ لَا يَجُوز الْخُرُوج عَلَى الْخُلَفَاء بِمُجَرَّدِ الظُّلْم أَوْ الْفِسْق مَا لَمْ يُغَيِّرُوا شَيْئًا مِنْ قَوَاعِد الْإِسْلَام''۔ (شرح النووی علی مسلم،ج:6،ص:327)

''پوچھا گیا کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں''۔ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ خلفاء کے خلاف خروج جائز نہیں صرف ظلم وفسق کی وجہ سے جب تک کہ وہ ''قواعد اسلام'' میں سے کسی چیز کو نہ بدل دیں''۔

علامہ ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فِي الْحَدِيث حُجَّة فِي تَرْك الْخُرُوج عَلَى السُّلْطَان وَلَوْ جَارَ، وَقَدْ أَجْمَعَ الْفُقَهَاء عَلَى وُجُوب طَاعَة السُّلْطَان الْمُتَغَلِّب وَالْجِهَاد مَعَهُ وَأَنَّ طَاعَته خَيْر مِنْ

الْخُرُوج عَلَيْهِ لِمَا فِي ذَلِكَ مِنْ حَقْن الدِّمَاء وَتَسْكِين الدَّهْمَاء''(فتح الباری،ج20ص58رقم:6530)

''سلطان چاہے ظالم ہی کیوں نہ ہو،اس کے خلاف مسلح بغاوت نہ کی جائے اور فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو سلطان زبردستی حاکم بن بیٹھا ہو تو (صحیح احادیث کے مطابق جائز امور میں)اس کی اطاعت واجب ہے،اور اس کے ساتھ مل کر جہاد بھی مشروع ہے،اور یہ کہ اس کی اطاعت مسلح بغاوت سے بہتر ہے کیونکہ اسی طریقے میں خونریزی سے بچاؤ اور مصیبتوں کا ازالہ ہے''

ان تمام احادیث اور سلف کے اقوال سے یہ بات سامنے آئی کہ فاسق اور خاص کر ظالم حکمران کے خلاف خروج کیا جاسکتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ سلف میں سے بعض فقہاء کرام ایسے حاکم کو ہر صورت ہٹانے کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ ایسے حاکم کی اس وقت تک اطاعت کی جائے اور اس کے خلاف خروج نہ کیا جائے جب تک اس بات کا قوی امکان نہ ہو کہ ایسے حاکم کو بغیر کسی بڑی خونریزی اور لڑائی کے بدل دیا جائے گا۔

اس ضمن میں ہم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا طرز عمل بھی جان لیتے ہیں۔چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے دور میں ''ظالم وفاسق حکمران'' کے خلاف خروج کے لئے طاقت کی شرط عائد کرنے کے باوجود،اگرچہ خود تو شرکت نہیں کی لیکن خرورج کرنے والوں کے لئے،جبکہ آپ رحمہ اللہ کو یہ اندازہ تھا کہ یہ خروج میں کامیاب نہیں ہوں گے،ان کی ہر ممکن مالی مدد کی اور ان کے حق میں فتاویٰ بھی جاری فرمائے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو جب حضرت ابراہیم الصائغ رحمہ اللہ نے حاکم وقت کے خلاف خروج میں مدد ونصرت کے لئے دعوت دی تھی۔امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس ملاقات کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''دَعَانِي اِلَى حَقٍّ مِنْ حُقُوقِ اللّٰهِ فَامْتَنَعْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ اِنْ قَامَ بِهِ رَجُلٌ وَحْدَهُ قُتِلَ ، وَلَمْ يَصْلُحْ لِلنَّاسِ أَمْرٌ، وَلٰكِنْ اِنْ وَجَدَ عَلَيْهِ أَعْوَانًا صَالِحِينَ وَرَجُلًا يَرْأَسُ عَلَيْهِمْ مَأْمُونًا عَلَى دَيْنِ اللّٰهِ لَا يَحُولُ''(احکام القرآن لجصاص رحمہ اللہ،ج:3،ص:465)

''انہوں نے مجھے حقوق اللہ میں سے ایک حق (فریضے) کی طرف دعوت دی۔ میں رُک گیا اور ان سے کہا کہ اگر اکیلا آدمی اس کام (یعنی خروج) کے لئے کھڑا ہو گا تو قتل کر دیا جائے گا اور لوگوں کے (اجماعی) معاملہ کی اصلاح بھی نہ ہو گی ، لیکن اگر اسے (خروج کے لئے) نیک وصالح معاونین اور قیادت کرنے والا مل جائے تو کوئی حرج نہیں ہے''۔

لیکن بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا ذکر مولانا مناظر حسن گیلانی رحمہ اللہ نے کیا ہے کہ بالآخر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ابراہیم الصائغ رحمہ اللہ کی حمایت کھلے عام کرنے لگے اور لوگوں کو بھی اس اہم فریضے کی ادائیگی کے لئے دعوت دیتے رہے:

''الیافعی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ابراہیم رحمہ اللہ کی حمایت کے لئے لوگوں کو علی الاعلان جہاد پر ابھارتے تھے اور لوگوں کو حکم دیتے تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر حکومت کا مقابلہ کرو۔ امام زفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم رحمہ اللہ کے زمانے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ان کی حمایت میں بڑے شد و مد کے ساتھ بولنے لگے تھے۔ کوفہ کے مشہور محدث ابراہیم بن سوید کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ابراہیم بن عبد اللہ کے خروج کے زمانے میں دریافت کیا کہ فرض حج ادا کرنے کے بعد آپ کا کیا خیال ہے کہ (نفلی) حج کرنا زیادہ بہتر ہے یا اس شخص یعنی ابراہیم کی رفاقت میں حکومت سے مقابلہ کرنا زیادہ ثواب کا کام ہے؟ ابراہیم بن سوید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ غور کے ساتھ میں نے دیکھا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرمارہے ہیں کہ: اس جنگ میں شرکت ایسے پچاس حج سے زیادہ افضل ہے''۔(بحوالہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی سیاسی زندگی، مؤلف سید مناظر حسن گیلانی رحمہ اللہ ص:343)

اسی طرح استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن، مولانا فضل محمد حفظہ اللہ اپنی کتاب ''دعوت جہاد ''میں نقل کرتے ہیں:

''مصیصہ چھاؤنی کے ایک کمانڈر کا بھائی ابراہیم رحمہ اللہ کے ساتھ ہو کر حکومت کی فوجوں کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ اس کا بھائی مصیصہ سے آیا اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ملا اور کہا کہ ''میرے بھائی کو آپ نے ابھارا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، یہ آپ نے بہت بُرا کیا ''۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں تو چاہتا تھا کہ کفار کے مقابلہ سے دست کش ہو کر تم یہاں آجاتے اور تمہارا بھائی جہاں ''شہید ''ہوا تھا وہیں پر تم بھی شہید ہو جاتے تو یہ اس سے بہتر ہوتا جو تم کفار کے مقابلے میں مصیصہ میں تھے اور تم جو جہاد کر رہے ہو اس سے مجھے یہ زیادہ پسند ہے جس میں تمہارا بھائی مارا گیا''۔ (دعوت جہاد از مولانا فضل محمد، ص:142 تا 144)

اور جب آپ کو ابراہیم الصائغ رحمہ اللہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ رحمہ اللہ کی کیفیت یہ تھی کہ جس کے بارے میں امام ابو بکر جصاص حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سَمِعْت ابْنَ الْمُبَارَكِ يَقُول: لَمَّا بَلَغَ أَبَا حَنِيفَةَ قَتْلُ ابْرَاهِيمَ الصَّائِغَ بَكَى حَتَّى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيَمُوتُ، فَخَلَوْت بِهِ فَقَالَ: كَانَ وَاَللَّهِ رَجُلًا عَاقِلًا، وَلَقَدْ كُنْت أَخَافُ عَلَيْهِ هَذَا الْأَمْرَ''۔ (احکام القرآن لجصاص رحمہ اللہ، ج:3، ص:465)

''میں نے سنا امام ابن مبارک رحمہ اللہ سے کہ وہ فرماتے ہیں کہ جب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو ابراہیم الصائغ رحمہ اللہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ رحمہ اللہ اس قدر روئے کہ ہم نے سمجھا کہ وہ اسی میں آپ کی موت واقع ہو جائے گی، پھر فرمایا کہ اللہ کی قسم! وہ صاحب عقل آدمی تھے اور مجھے ان پر اسی بات کا خوف تھا''

ایک اور روایت میں ہے کہ:

''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ ظالم حکمرانوں کے خلاف(جبکہ معتدبہ قوت ہو)بغاوت کرنی چاہیے جیسا کہ ابو اسحاق الفزاری نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ کو اللہ کا ڈر نہیں ہے کہ میرے بھائی کو ابراہیم (ابراہیم بن عبداللہ بن الحسن ہیں) کی معیت میں(خلیفہ کے خلاف)بغاوت پر اکسایا، آمادہ کیا؟امام صاحب نے کہا کہ اگر وہ بدر میں مارا جاتا تو؟اللہ کی قسم میرے نزدیک یہ بدر صغری ہے''۔(شذرات الذہب:1/44،تاریخ بغداد:13/384)

اس کے علاوہ جب زید بن علی نے ظالم حکمران کے خلاف خروج کیا تو آپ رحمہ اللہ کا عمل کیا تھا ؟امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَقَضِيَّتُهُ فِي أَمْرِ زَيْدِ بْنِ عَلِيٍّ مَشْهُورَةٌ وَفِي حَمْلِهِ الْمَالَ اِلَيْهِ وَفُتْيَاهُ النَّاسَ سِرًّا فِي وُجُوبِ نُصْرَتِهِ وَالْقِتَالِ مَعَهُ''۔(احکام القرآن لجصاص رحمہ اللہ،ج:2،ص:32)

''زید بن علی(کے خروج)کے معاملے میں ان (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ)کا طرز عمل مشہور ہے۔ان کو (اس خروج کے لئے)مال دینے اور لوگوں کو مخفی طور پر ان کی نصرت کے وجوب اور ان کے ساتھ مل کر قتال کرنے کے فتوے کے بارے میں بھی ان کا طرز عمل مشہور ہے''۔

کفر وارتداد کے مرتکب حکمران کے بارے میں شریعت کا حکم:

عمارتِ خلافت کی موجودگی میں ایسا حاکم جو کہ صریح کفر وارتداد میں مبتلا ہو جائے تو سلف وخلف سب نے بالاتفاق اس کو واجب العزل قرار دیا اور اس کے خلاف خروج کو ''فرضِ عین ''قرار دیتے ہوئے اس کو ''جہاد فی سبیل اللہ '' سے تعبیر کیا جو کہ ہر قدرت رکھنے والے مسلمان پر واجب ہو جاتا ہے اور جو قدرت نہ رکھتا ہو، اس کے لئے اس سرزمین سے ہجرت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔امام ابن حزم رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''اگر یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کسی اور کو حلال حرام قرار دینے کا حق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہیں تھا، یا کسی حد کو لازمی قرار دے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھی، یا ایسا شرعی قانون بناتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہیں تھا تو وہ شخص کافر مشرک ہے، اس کی جان ومال کا حکم مرتد کا ہے''۔(مجموع الفتاوی:524/28)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خلاصۂ کلام یہ کہ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے کہ حکمران کفر کی بناء پر (ازخود) معزول ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان پر اس کے خلاف خروج میں حصہ ڈالنا واجب ہو جاتا ہے۔ پھر جو اس کی قدرت رکھے اور اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو وہ ثواب کا مستحق ہو گا، اور جو کوئی (قدرت کے باوجود) مداہنت و مصالحت کا رویہ اپنائے وہ گناہ گار ٹھرے گا اور جو کوئی اس کافر حکمران کے خلاف اٹھنے کی قدرت نہ رکھے، اس پر واجب ہے کہ وہ اس سرزمین سے ہجرت کر جائے''۔(فتح الباری 13/123)

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اجمعوا علی ان الامامة لا تنعقد لکافر ولو طرأعلیه الکفر انعزل وکذا لوترك اقامة الصلوات والدعاء الیها وکذ البدعة''(مرقاة المفاتیح؛ج:11،ص:303)

''اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کوئی کافر مسلمانوں کا حاکم نہیں بن سکتا اور حاکم بننے کے بعد کفر کا ارتکاب کرے تو معزول قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر وہ نماز قائم کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا چھوڑ دے یا بدعت جاری کرے تب بھی اس کو یہی حکم ہے''۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''أَجْمَعَ الْعُلَمَاء عَلَى أَنَّ الْإِمَامَة لَا تَنْعَقِد لِكَافِرٍ، وَعَلَى أَنَّهُ لَوْ طَرَأَ عَلَيْهِ الْكُفْر اِنْعَزَلَ، قَالَ: وَكَذَا لَوْ تَرَكَ إِقَامَة الصَّلَوَات وَالدُّعَاء إِلَيْهَا'' (شرح النووی رحمہ اللہ علی مسلم؛ج:6،ص:314 رقم:3427)

''اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ کوئی کافر مسلمانوں کا امام (حکمران) نہیں بن سکتا اور اسی طرح اگر امام بننے کے بعد کوئی حاکم (قولی یا فعلی کفر و ارتداد کی وجہ سے) کافر ہو جائے تب بھی فوراً معزول ٹھیرے گا۔ نیز اگر وہ نماز قائم کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا چھوڑ دے تب بھی معزول قرار پائے گا''۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''فَلَوْ طَرَأَ عَلَيْهِ كُفْر وَتَغْيِير لِلشَّرْعِ أَوْ بِدْعَة خَرَجَ عَنْ حُكْم الْوِلَايَة، وَسَقَطَتْ طَاعَته، وَوَجَبَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ الْقِيَام عَلَيْهِ، وَخَلْعه وَنَصْب إِمَام عَادِل إِنْ أَمْكَنَهُمْ ذَلِكَ، فَإِنْ لَمْ يَقَع ذَلِكَ إِلَّا لِطَائِفَةٍ وَجَبَ عَلَيْهِمْ الْقِيَام بِخَلْعِ الْكَافِر، وَلَا يَجِب فِي الْمُبْتَدِع إِلَّا إِذَا ظَنُّوا الْقُدْرَة عَلَيْهِ، فَإِنْ تَحَقَّقُوا الْعَجْز لَمْ يَجِب الْقِيَام، وَلْيُهَاجِرْ الْمُسْلِم عَنْ أَرْضه إِلَى غَيْرهَا، وَيَفِرّ بِدِينِهِ'' (شرح النووی رحمہ اللہ علیٰ مسلم؛ج:6،ص:314 رقم:3427)

''اگر کوئی حکمران کفر کا ارتکاب کرے، یا شریعت میں کوئی ردوبدل کرے، یا کوئی بدعت جاری کرے تو وہ بطور حکمران باقی نہیں رہتا، اس کی اطاعت ''ساقط'' ہو جاتی ہے اور مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ اگر وہ قدرت رکھتے ہوں تو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اسے ہٹا کر اس کی جگہ کوئی عادل حکمران مقرر کریں۔ نیز اگر پوری امت میں سے محض کوئی ایک گروہ یہ قدرت رکھتا ہو تو اس گروہ پر واجب ہو گا کہ وہ اس کافر حاکم کو اس کے منصب سے ہٹائے۔ یہ تو کافر حکمران کا معاملہ تھا، رہا بدعتی حکمران کو ہٹانا، تو تبھی واجب ہو گا جب اس بات کا غالب امکان ہو کہ اس پر غلبہ پالیا جائے گا۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے

کہ مسلمان (بدعتی حکمران کے خلاف) اتنی قدرت بھی نہیں رکھتے تو ایسے حکمران کے خلاف خروج واجب نہیں ہو گا۔ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض بنتا ہے کہ اوہ اپنے دین کو بچاتے ہوئے اس سرزمین سے نکل جائے"۔

امام الحرمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اسلام ہی اصل ہے بالفرض اگر کوئی امام دین سے نکل جائے تو اس کے منصب چھیننے اور امامت کے انقطاع اور منصب سے معزولی کو مخفی نہیں رکھاجائے گا"۔(غیاث الامم،ج:1ص:75)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اگر کوئی ایسا شخص حکمران بن جائے جس میں تمام شروط مکمل طور پر نہیں پائی جاتیں تو اسکی مخالفت میں جلدی نہیں کرنی چاہیے اس لئے کہ اس مخالفت سے ملک میں لڑائی جھگڑے فسادات پیدا ہوں گے جو کہ ملک و قوم کے مصلحت کے خلاف ہے بلکہ بہت زیادہ بگاڑ کا سبب بنیں گے لیکن اگر حکمران نے کسی اہم "دینی امر" کی مخالفت کی تو اس کے خلاف قتال جائز ہو گا بلکہ واجب ہو گا۔اس لئے کہ اب اس نے اپنی افادیت ختم کر دی ہے اور قوم کے لئے مزید فساد و بگاڑ کا سبب بن رہا لہٰذا اس کے خلاف قتال "جہاد فی سبیل اللہ" کہلائے گا۔"(حجۃ اللہ البالغۃ،ج:2ص:399)

ایک غلط فہمی اور اس کا سد باب:

اس موقع پر ایک غلط فہمی ہے جسے دور کرلینا چاہیے۔وہ یہ کہ بعض احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم جس میں ظالم حکمرانوں کے خلاف خروج کرنے اور ان کے خلاف تلوار اٹھانے سے اس وقت تک

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا جب تک کہ وہ مسلمانوں میں نظام صلوۃ کا قیام کرتے رہیں۔ مثلاً:

((عَوْفَ بْنَ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيَّ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ خِيَارُ أَئِمَّتِكُمْ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمْ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ قَالُوا قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذَلِكَ قَالَ لَا مَا أَقَامُوا فِيكُمْ الصَّلَاةَ لَا مَا أَقَامُوا فِيكُمْ الصَّلَاةَ)) (صحیح مسلم ج9ص404 رقم الحدیث:3448)

"حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ تم ان کے حق میں دعاء کرو اور وہ تمہارے حق میں دعاء کریں اور بدترین حکمران تمہارے وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرو اور وہ تمہیں ناپسند کریں، تم ان پر لعنت کرو اور وہ تمہارے اوپر لعنت کریں۔ راوی کہتے ہیں ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم ان کی بیعت توڑ کر ان کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں، نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں"۔

ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

((أَفَلَا نُنَابِذُهُمْ بِالسَّيْفِ فَقَالَ لَا مَا أَقَامُوا فِيكُمْ الصَّلَاةَ)) (صحیح مسلم ج9ص404 رقم الحدیث:3447)

"کیا ہم ان کے ساتھ تلوار سے جنگ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں"۔

((عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَتَكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ قَالُوا أَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَا صَلَّوْا))(صحیح مسلم،ج9ص400رقم الحدیث:3445)

''ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر ایسے امیر مقرر ہو جائیں گے تم ان کی کچھ باتوں کو اچھا سمجھو گے اور کچھ کو برا۔ جس نے پہچان لیا وہ ان سے بری ہوا، جس نے ان کا انکار کیا وہ سالم رہا اور جو راضی ہوا اور تابعداری کی (وہ ہلاک ہوا)۔ پوچھا گیا کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں''۔

ان احادیث کی وضاحت تو امام نووی رحمہ اللہ کے اس کلام سے ہی ہو جاتی ہے کہ:

''وَأَمَّا قَوْله:(أَفَلَا نُقَاتِلهُمْ ؟ قَالَ :لَا ، مَا صَلَّوْا) فَفِيهِ مَعْنَى مَا سَبَقَ أَنَّهُ لَا يَجُوز الْخُرُوج عَلَى الْخُلَفَاء بِمُجَرَّدِ الظُّلْم أَوْ الْفِسْق مَا لَمْ يُغَيِّرُوا شَيْئًا مِنْ قَوَاعِد الْإِسْلَام ''۔(شرح النووی علی مسلم،ج:6،ص:327)

''پوچھا گیا کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں''۔ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ خلفاء کے خلاف خروج جائز نہیں صرف ظلم و فسق کی وجہ سے جب تک کہ وہ ''قواعد اسلام'' میں سے کسی چیز کو نہ بدل دیں''۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ ان احادیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''معنی ما صلّوا:مادامو ا علی الاسلام ،فالصلوۃ اشارۃ ذلك''(تکملۃ فتح الملہم ج:3ص:199)

"یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "جب تک وہ نماز پڑھیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام پر باقی رہیں، نماز سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا"۔

اس کے باوجود ان احادیث کی بنیاد پر بعض لوگ یہ بات اخذ کرتے ہیں کہ حکمران چاہے کتنا ہی افعالِ کفر و ارتداد کرتا رہے، کتنا ہی الحکم بغیر ما انزل اللہ کے حکومت کرتا رہے اور کتنا ہی کفار و مشرکین سے اپنی وفاداریاں نبھاتا رہے لیکن وہ اگر نماز کا قیام کر رہا ہے تو اس کا مسلمانوں پر حکومت کرنا جائز ہے اور اس کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں، حالانکہ یہ بات کسی صورت درست نہیں۔ اول بات یہ کہ سلف وخلف اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں قیام صلوٰۃ سے پورے کے پورے "دین اللہ" کا قیام ہے۔

ایسا حکمران جو کہ الحکم بغیر ما انزل اللہ کے حکومت کرے تو اس کی نماز ہی بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں تو ایسے شخص کی "ولایت" کیسے قبول کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((عن طلحۃ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ألا أیھا الناس لا یقبل اللہ صلاۃ امام حکم بغیر ما أنزل اللہ))

(مستدرك الحاكم للصحيحين، ج:16ص:330، رقم:7108۔ هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه)

"حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: آگاہ ہو جاؤ! اللہ اُس امام کی نماز قبول نہیں کرتا جو کہ اللہ کی نازل کردہ (شریعت) کے سوا فیصلے جاری کرے"۔

اور ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

((لا یقبل اللہ صلاۃ امام حکم بغیر ما أنزل اللہ ولا یقبل اللہ صلاۃ عبد بغیر طھور ولا صدقۃ من غلول))(كنز العمال، ج:6ص:40رقم:14762)

"اللہ اُس امام کی نماز قبول نہیں کرتا جو کہ اللہ کی نازل کردہ (شریعت) کے سوا فیصلے جاری کرے (جیسے) اللہ قبول نہیں کرتا کسی بندے کی بغیر طہارت کے نماز اور وہ صدقہ جو غبن کئے ہوئے مال میں سے دیا جائے"۔

دوم اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ یہاں اس سے صرف نماز کا قیام ہی مراد ہے تو سوال یہ ہے کہ جو حکمران نظام صلوۃ کا قیام نہ کرے، کیا وہ کافر یا مرتد قرار پاتا ہے؟ اکثر اہل علم کے نزدیک ایسا شخص جو تارکِ نماز ہو مگر منکرِ نماز نہ ہو، کافر یا مرتد نہیں ہوتا! لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر حکومت کرنے والے ایسے شخص کو حق ولایت سے محروم کر دیا جو منکرِ نماز نہیں صرف مسلمانوں میں قیامِ صلوٰۃ نہیں کرتا، تو کیا ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ایسے حکمرانوں کا مسلمانوں پر حق ولایت تسلیم کریں گے جن کا کفر وارتداد مبین ہو اور جو "کفر بواح" یا صریح ارتداد کے مرتکب ہو چکے ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حکمران جو کھلم کھلا کفر کا حکم نہیں بلکہ صرف اس کا ارتکاب کر بیٹھیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اطاعت کا ہاتھ کھینچ لینے اور ان سے تلوار سے نمٹنے کا حکم دیا ہے اور اسی بنیاد پر امت کے فقہاء ایسے حکمرانوں کے خلاف خروج کو ہر مسلمان پر لازم اور "فرضِ عین" قرار دیتے ہیں۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی روایات کے الفاظ یوں ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

((دَعَانَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْنَاهُ فَكَانَ فِيمَا أَخَذَ عَلَيْنَا أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَأَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ قَالَ إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ))(صحیح مسلم، ج9ص374رقم الحدیث:3427)

"ہمیں بلایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ پس آپ نے ہم سے اس بات پر بیعت لی کہ ہم سنیں گے اطاعت کریں گے چاہے حالات سخت ہوں یا ساز گار، خوشی ہو یا غمی، ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے پھر بھی اور ہم اہل حکومت سے اختیارات واپس نہ لیں سوائے اس صورت

کے کہ ان سے ایسا "واضح کفر" سرزد ہو جائے جس کے کفر ہونے پر اللہ کے دین میں صریح دلیل موجود ہو"۔

درج بالا حدیث کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کفر بواح" کے صرف ارتکاب پر حاکم کو واجب العزل قرار دے دیا۔ اسی طرح بعض احادیث کے مطابق اگر وہ کھلم کھلا معصیت کا "حکم" بھی دینا شروع کر دے جس کو فقہاء نے "فسق متعدی" سے تعبیر کیا ہے اور اس کا حکم بھی "کفر بواح" کا ہی ہے۔ احادیث مبارکہ یوں ہیں:

((عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذَلِكَ قَالَ مَا لَمْ يَأْمُرُوكَ بِإِثْمٍ بَوَاحًا))(مسند احمد ج:46 ص:221، رقم الحديث:21675)

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بیعت لی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوائے اس کے کہ وہ تمہیں کھلم کھلا گناہ کا حکم دے"۔

((الاان يأمرك باثم بواحاعندك تأويله من الكتاب))(مسند الشامين ج:1 ص:141، رقم الحديث225)

"سوائے اس کے کہ وہ حکم دے تم کھلے گناہ کا جس کی دلیل تمہارے پاس کتاب (و سنت) سے ہو"۔

((عبادة ابن صامت يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم! ثم يا عبادة، قلت لبيك، قال اسمع واطع فى عسرك ويسرك ومكرهك واثرة عليك وان اكلوا مالك وضربواظهرك الا ان تكون معصية الله بواحا))(صحيح ابن حبان ج:10 ص:428، رقم الحديث 4566)

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبادۃ! انہوں نے کہا حاضر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنو اور اطاعت

کرو چاہے تمہیں آسان لگے یا مشکل اور چاہے تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور چاہے وہ تمہارے مال لے لے اور تمہاری پیٹھوں پر مارے سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کھلم کھلا نافرمانی کا حکم دے''۔

((یا عبادة اسمع واطع فی عسرك ویسرك ومنشطك ومكرهك واثرة علیك وان اكلوا مالك وضربوا ظهرك الا ان تكون معصیة الله عزوجل بواحا))(الفردوس بماثور الخطاب ج:5ص:385،رقم الحدیث 8506)

''اے عبادۃ! سنو اور اطاعت کرو چاہے تمہیں آسان لگے یا مشکل اور چاہے تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور چاہے وہ تمہارے مال لے لے اور تمہاری پیٹھوں پر مارے سوائے اس کے بات کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کھلم کھلا نافرمانی کا حکم دے''۔

اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

((مالم یأمروك باثم بواحا)) (السنة لابن عاصم ج:3ص157،هذااسناد صحیح علی شرط الشیخین)

''جب تک وہ تمہیں حکم نہ دیں کھلم کھلا معصیت کا''۔

چنانچہ ''فسق معتدی'' کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ساتویں قسم یہ ہے کہ حاکم ایسے فسق کا مرتکب ہوجو (اس کی ذات تک محدود نہ ہو بلکہ)لوگوں کے دین پر اثر انداز ہو؛مثلاً وہ انہیں گناہوں پر مجبور کرے۔ اس جبر پر ''اکراہ''ہی کے احکامات لاگو ہوتے ہیں،جو کہ اپنے مقام پر تفصیلاً بیان کئے جاچکے ہیں۔یہ جبر وواکراہ بعض مرتبہ حقیقتاً اور بعض مرتبہ حکماً کفر میں داخل ہوجاتا ہے.مثلاً جب حاکم شریعت سے متصادم قوانین (جو کہ معصیات پر مبنی ہوں ان)کے نفاذ پر اصرار کرے۔اب اگر تو وہ ایسا اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ ان کے خلافِ شرع قوانین کو شرعی

قوانین سے بہتر سمجھتا ہے تو یہ "کفر صریح" ہے اور اگر وہ (ایسا نہیں سمجھتا لیکن) شریعت کے نفاذ میں سستی ولاپرواہی سے کام لیتا ہے اور غالب گمان یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک (معصیت پر مبنی) خلافِ شرع نظام چلتے رہنے کے نتیجے میں دلوں سے شریعت کی عظمت اٹھ جائے گی۔ تو ایسی سستی و "غفلت" اگرچہ حقیقتاً کفرِ صریح تو نہیں کہ اس کے مرتکب کو کافر قرار دیا جائے لیکن اسے حکم شرعی کے اعتبار سے کفر ہی میں داخل سمجھا جائے گا۔ (جیسا کہ فقہ کا اصول ہے کہ مقدمۃ الشئی بحکمِ ذلك الشیئی)۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی علاقے کے لوگ اذان دینے سے انکار کر دیں تو ان کے خلاف قتال جائز ہو گا کیونکہ اذان شعائر دین (اور سنن) میں سے ہے اور اسے ترک کرنا اس کی عظمت و اہمیت کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ تفصیل کے لئے کتاب "ردالمختار" کا باب "باب الاذان" دیکھئے۔ پس اس صورت میں یہ ساتویں قسم بھی تیسری قسم یعنی کفرِ بواح (کفرِ صریح) میں شامل سمجھی جائے گی اور ایسے میں تیسری قسم میں ذکر کردہ تفصیلی احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے خروج جائز ہو گا"۔ (تکلمۃ فتح الملھم بشرح صحیح المسلم ،المجلد الثالث ،کتاب الامارۃ)

درج بالا کلام سے جو کہ ہم ظلم وفسق اور کفر وارتداد کے ساتھ حکومت کرنے والے کے ضمن میں پڑھ آئے ہیں اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ "قدرت وطاقت" کی شرط صرف ظالم وفاسق حکمران کے خلاف خروج کے لئے ہے ورنہ بصورت دیگر صبر اور انتظار کا حکم ہے لیکن حاکم کے کفر بواح کی صورت میں "خروج" پوری امت پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اگر امت غفلت کا مظاہرہ کرے تو ایک چھوٹے سے گروہ پر بھی واجب ہو گا کہ اس حاکم کو معزول کر دیں اور جو کوئی قدرت نہ رکھتا ہو اس کے لئے یہ نہیں کہ وہ اطمینان وسکون سے وہاں زندگی گزارتا رہے بلکہ اس کے لئے اس سرزمین سے ہجرت کر جانے کا حکم ہے۔ جیسا کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کا کلام ہم پیچھے پڑھ آئے کہ:

''وَلْيُهَاجِرِ الْمُسْلِمِ عَنْ أَرْضه اِلَى غَيْرِهَا، وَيَفِرّ بِدِينِهِ'' (شرح النووی رحمه الله علی مسلم؛ج:6،ص:۳۱۴ رقم:3427)

''ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے دین کو بچاتے ہوئے اس سرزمین سے نکل جائے''۔

اور جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خلاصۂ کلام یہ کہ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے کہ حکمران کفر کی بناء پر (از خود) معزول ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان پر اس کے خلاف خروج میں حصہ ڈالنا واجب ہو جاتا ہے۔ پھر جو اس کی قدرت رکھے اور اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو وہ ثواب کا مستحق ہو گا، اور جو کوئی (قدرت کے باوجود) مداہنت و مصالحت کا رویہ اپنائے وہ گناہ گار ٹھہرے گا اور جو کوئی اس کافر حکمران کے خلاف اٹھنے کی قدرت نہ رکھے، اس پر واجب ہے کہ وہ اس سرزمین سے ہجرت کر جائے''۔(فتح الباری،13/123)

لَاطَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ :

کافر و مرتد حاکم کے معزول ہونے اور اس کے خلاف مسلح خروج، جس کو فقہاء نے ''جہاد فی سبیل اللہ'' سے تعبیر کیا ہے، اس کی عدم قدرت کی بناء پر ''ہجرت'' کے واجب ہونے کے شرعی حکم سے یہاں اُن لوگوں کے شبہات کا بھی رد ہو جاتا ہے جو کہ عمرانی ارتقاء کی بنیاد پر عددی قوت اور ٹیکنالوجی کی کمی کی وجہ سے فی زمانہ قتال فی سبیل اللہ کے حوالے سے ''اجتہاد'' کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج ہمارے پاس وہ عددی قوت اور ٹیکنالوجی نہیں جس کے ذریعے ہم باطل سے پنجۂ آزمائی کریں۔ چنانچہ موجودہ دور میں صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ''الیکشن'' یا ''پُر امن احتجاجی تحریک'' کے ذریعے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ اور ان کے پروردہ حکمرانوں کے ظلم و ستم سے نجات دلائی جائے۔

چنانچہ کفاراور عصر حاضر کے طواغیت کو حاصل عددی قوت، ٹیکنالوجی اور ان کا عسکری دبدبہ دیکھ کر بعض لوگ ''قتال فی سبیل اللہ''کو عملاً آج ناممکن سمجھتے ہیں اور جب اقامت دین کے لئے کھڑے ہونے کا دعویٰ رکھنے والی جماعتیں ایسی بات کہیں کہ ''لَاطَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ ''(کہ آج ہم میں لڑنے کی طاقت نہیں ہے)توبڑی ہی حیرانگی ہوتی ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کہتے ہیں کہ:

''دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوع انسانی کا جو تمدنی ارتقاء ہوا ہے اس کے اعتبار سے اب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل اور پوری قوت موجود ہوتی ہے ،جبکہ عوام اب بالکل نہتے ہو گئے ہیں۔چنانچہ حکومت اور عوام کے مابین فرق وتفاوت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ جو مسلح تصادم (Armed conflict)والا مرحلہ ہے،یعنی پہلے سے قائم شدہ باطل نظام سے مسلح تصادم کا معاملہ وہ نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے قریباً ناممکن ہو چکا ہے''۔(منہج انقلاب نبوی،ص336)

پہلی بات تو اس ضمن میں یہ ہے کہ ''قتال فی سبیل اللہ''ازروئے قرآن وحدیث قیامت تک کے لئے ایک محکم شرعی فریضہ ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾(سورة البقرة:216)

''تم پر قتال کا کرنا فرض کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنا ہی ناپسند ہو اور ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے شر ہو اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو''۔

((بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ حَتَّى يُعْبَدَ اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَجُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي وَجُعِلَ الذِّلَّةُ وَالصَّغَارُ عَلَى مَنْ خَالَفَ أَمْرِي وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))

(مسند احمد، ج:10، ص:405، رقم الحدیث:4869۔ کنز العمال، ج:4، ص:286، رقم الحدیث:10528۔ مصنف ابن ابی شیبۃ، ج:4، ص:575۔ شعب الایمان، ج:3، ص:251، رقم الحدیث:1202)

"مجھے قیامت تک کے لئے "تلوار" کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اللہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت کی جانے لگے اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے تلے رکھ دیا گیا ہے اور جس نے میرے (اس) "امر" کی مخالفت کی، اُس کے لئے ذلت اور پستی رکھ دی گئی اور جس نے (میرے اس طریقے کو چھوڑ کر) کسی (دوسری) قوم کی مشابہت اختیار کی تو (اس کا شمار) اُنہی میں ہو گا۔"

بس جب اب یہ طے پا چکا کہ "قتال فی سبیل اللہ" قیامت تک کے لئے ایک محکم شرعی فریضہ ہے جو کہ شریعت کے بیان کردہ حالات اور شرائط کی بنیاد پر فرض ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حاکم کے کفر وارتداد کی بناء پر اس کے خلاف جہاد کا فرض ہونا چنانچہ جب یہ حالت وارد ہو جائے تو پھر صورت مسئولہ میں دو ہی صورتیں شرعی طور پر ممکن ہیں، اوّل یہ کہ قدرت ہونے پر مسلح خروج یا عدم قدرت پر مسلح خروج کی تیاری کی جائے کیونکہ اصول یہ ہے کہ "مَالَا يَتِمُّ الْوَاجِبُ اِلَّا بِهٖ فَهُوَ وَاجِبٌ"، "جس معاون چیز کے ساتھ کسی واجب کی ادائیگی ہوتی ہے وہ کام بھی واجب ہے" (مجموع الفتاویٰ :۸۲/۹۵۲)، دوم یہ کہ عدم قدرت پر اس سرزمین سے ہجرت کر جانا، اس کے علاوہ کوئی تیسری شرعی صورت ممکن نہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے واضح احکام شریعت کی موجودگی میں اب کسی "اجتہاد" کی یا عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ:

(لَا اِجْتِهَادَ مَعَ النَّصِّ)

"نص کی موجودگی میں کوئی اجتہاد نہیں"۔

دوسری بات یہ کہ جو لوگ "قتال فی سبیل اللہ" کے لئے کفار یا مسلمانوں پر مسلط طواغیت کے مساوی قوت و استعداد کے حصول کو لازمی قرار دیتے ہیں، اور اس کے بغیر "قتال فی سبیل اللہ" کے اختیار کرنے کو "ہلاکت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اوّل یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس مساوی قوت و استعداد کے حصول کو لازمی قرار دیا جاتا ہے وہ تو شاید قیامت تک بھی مسلمانوں کو حاصل نہ ہو سکے، سوائے اللہ کی مدد و نصرت کے، اور یہ بھی کہ قرآن کریم نے اہل ایمان کو قوت جمع کرنے کا جو معیار دیا ہے وہ اپنی "مقدور بھر استطاعت" کا ہے نہ کہ کفار و مرتدین کے مساوی قوت کے حصول کا۔

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال:60)

"اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان (کفار و مرتدین) کے خلاف قوت جمع کرو"۔

پھر تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے کہ اہل ایمان نے کبھی جنگوں میں کامیابی اپنی قوت و استعداد کی بناء پر حاصل نہیں کی اور نہ ہی کبھی ان اہل ایمان کو کفار کے یا ان کے معاونین کے مساوی طاقت و استعداد حاصل رہی (سوائے چند ایک استثناء کے) بلکہ ہمیشہ ان کو فتح و کامرانی جزبۂ جہاد، مقدور بھر تیاری اور پھر اللہ پر کامل توکل کی بنیاد پر ملی۔

قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ طالوت و جالوت میں دراصل یہی سبق ہے کہ اپنی مقدور بھر استطاعت کو اختیار کرنے کے بعد اللہ پر توکل کیا جائے اور "عمرانی ارتقاء" کی وجہ سے جو عددی اور عسکری برتری کفار و مرتدین کو حاصل ہو اس کو "قتال فی سبیل اللہ" کے فریضہ سے فرار کے لئے بطور دلیل اختیار نہ کیا جائے، جیسا کہ بعض لوگوں نے طالوت و جالوت کی لڑائی کے موقع پر یہ مؤقف اختیار کیا تھا، جس کا رد قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا:

﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (سورۃ البقرۃ:249)

"پھر جب طالوت اور اس کے (مسلمان ساتھی) دریا پار کر کے آگے بڑھے، تو انہوں نے طالوت سے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کو اس بات کا یقین تھا کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انہوں نے کہا "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اِذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اس کے برعکس جب غزوۂ حنین کے موقع پر جب مسلمانوں کو اپنی کثرتِ تعداد اور اپنی طاقت و استعداد پر تھوڑا سا ناز ہو گیا تھا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً تنبیہ اس صورت میں آئی کہ لشکر اسلام کے عارضی طور پر قدم اکھڑنے لگے۔ مگر بعد میں اللہ کی نصرت و مدد سے فتح یابی نصیب ہوئی۔

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ، ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (التوبة:26،24)

"بے شک اللہ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد فرمائی اور غزوۂ حنین کے دن بھی جبکہ تمہیں اپنی کثرتِ تعداد پر ناز تھا، مگر وہ تمہارے کسی کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اُتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کا جو حق کا انکار کریں"۔

آج بھی اگر اہل ایمان کا اللہ کی مدد ونصرت پر اور معجزات پر کامل یقین ہو اور کفار کے مساوی نہیں بلکہ اپنی مقدور بھر تیاری کے ساتھ میدان میں اُتریں، تو اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا﴾ (سورۃالاحزاب:25)

''اور اللہ تعالیٰ کافی ہے مومنوں کی طرف سے جنگ کے لئے اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا اور زبردست ہے''

﴿وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾(الانفال:19)

''(اے کافرو!) تمہاری جمعیت، خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی (کیونکہ) اللہ مومنوں کے ساتھ ہے''۔

فضائے بدر پیدا کر کہ فرشتے تیری نصرت کو

گردوں سے اتر سکتے ہیں قطار اندر قطار اب بھی

خلاصہ ٔ کلام:

چنانچہ تمام سلف وصالحین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب حاکم وقت کفر بواح اور صریح ارتداد کا مرتکب ہو جائے تو خود بخود واجب العزل ہو جاتا ہے اور اس کی اطاعت ساقط ہو جاتی ہے اور ہر مسلمان جو کہ قدرت رکھتا ہو اس پر مسلح خروج کرنے والوں کا ساتھ دینا فرض ہو جاتا ہے، اور جو قدرت رکھنے باوجود خروج نہ کرے وہ گناہ گار ٹھہرتا ہے اور جو قدرت نہ پائے اس پر ہجرت لازم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور تیسری سبیل نہیں۔

یہ ہیں وہ واضح احکامات جو کہ ظالم وفاسق اور کافر ومرتد حکمران کے بارے میں اور اس کو تبدیل کرنے کے بارے میں شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں، تو جو کوئی ان احکامات کی موجودگی میں صرف قرآن کو ہی شرعی قوانین کا منبع سمجھتے ہوئے یہ کہے کہ:

"قرآن حکیم میں سیاسی اور معاشی نظام کا کوئی ڈھانچہ سرے سے کوئی موجود نہیں ہے"۔

اور پھر یہ کہے کہ:

"اولی الامر کی اطاعت کا حکم تو دیا گیا ہے مگر ان کے تقرر کا طریقہ کو واضح نہیں کیا گیا ۔ تقرر کے طریقے کی وضاحت نہ ہونے کی حکمت یہی ہے کہ ہم اپنے تمدنی حالات کے لحاظ سے اور معاشرتی ارتقاء کے مطابق بہتر سے بہتر قابل عمل طریقہ خود اختیار کر سکیں"۔

اور پھر یہ کہے کہ آج "اجتہاد" کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے "عمرانی ارتقاء" کے نام پر ایسے طریقے اختیار کرے جس کو نہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں نازل کیا اور نہ ہی اس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا اور نہ ہی ہمارے اسلاف میں سے کسی نے ان کو اختیار کیا، تو ایسے طرز عمل پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾(المائدۃ:50)

"(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں اُن کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے"۔

دوسرا مسئلہ

دارالاسلام اور دارالحرب کے احکامات کو خلط ملط کر دینا

عصر حاضر میں جس طرح اقامت دین کے فریضہ کی ادئیگی کے لئے کھڑی ہونے والی اکثر جماعتیں اس بات کا تعین نہیں کرتیں کہ وہاں حکومت کرنے والے کی حیثیت کیا ہے؟ بالکل اسی طرح وہ اس بات کا تعین کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتیں کہ جس سرزمین پر وہ یہ تحریک برپا کرنے جارہے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا وہ دار الاسلام ہے یا دارالحرب؟ کیونکہ احکام شرعیہ کا بہت بڑا حصہ اس بات پر موقوف ہے کہ آیا ان پر عمل کرنے والے دار الاسلام میں ہیں یا دارالحرب میں۔ چناچہ مفتی اعظم پاکستان محمد شفیع رحمہ اللہ اس مسئلہ کی ضرورت و اہمیت پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”جو لوگ فقہ اور فتاوی سے مناسبت رکھتے ہیں اُن پر یہ بات مخفی نہیں کہ تقریباً فقہ کے تمام ابواب نماز، روزہ، حج، زکوۃ، نکاح، طلاق اور بالخصوص بیع و شراء، اجارہ و دیگر معاملات میں سینکڑوں مسائل شرعیہ ہیں (ایسے ہیں جن کا حکم) دار الاسلام کے لئے کچھ (اور) ہے اور دار الحرب کے لئے دوسرا۔ اس لئے اگر یوں کہا جائے کہ احکام شرعیہ کا ایک بہت بڑا حصہ اس پر موقوف ہے کہ ان پر عمل کرنے والے جس ملک میں آباد ہیں، پہلے اس کا دارالاسلام یا دار الحرب ہونا متعین کریں تو بالکل صحیح و درست ہے“۔ (”فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب ودار الاسلام“۔ بحوالہ تالیفات رشیدیہ، ص:654، ادارہ اسلامیات لاہور)

لہٰذا اس سے پہلے کہ ہم کسی خطۂ زمین کو دار الاسلام یا دار الحرب قرار دیں، ہم سلف و صالحین کے فتاویٰ کی روشنی میں شرعاً ان دونوں اصطلاحات کو سمجھ لیتے ہیں۔

دارالاسلام سے مراد:

فقہاء نے باتفاق کسی بھی علاقے کو دار الاسلام قرار دینے کے لئے دو شرطیں ہی بیان کی ہیں:

(۱) حاکم کا مسلمان ہونا۔ (۲) احکام اسلامی کا اجراء

امام سرخسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''وبمجردالفتح قبل اجراءاحکام الاسلام لاتصیر دارلاسلام''(مبسوط سرخسی ،ص۳۲،ج10)

'' صرف فتح کے بعد احکامِ اسلام کے اجراء کے بغیر دارالحرب، دارالاسلام میں تبدیل نہیں ہوتا۔''

''وکذلك لو فتح المسلمون أرضاً من ارض العدو حتی صارت فی ایدیهم وهرب اهلها عنها۔ لانها صارت دار الاسلام بظهور احکام الاسلام فیها''۔(شرح السیر الکبیر؛ج:2ص:185)

''اسی طرح اگر مسلمان دشمنوں کی کوئی زمین فتح کرلیں یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کے ماتحت ہو جائے اور اس کے رہنے والے بھاگ جائیں (یعنی مغلوب ہو جائیں) تو یہ علاقہ احکام اسلام کے ظاہر ہونے سے دار الاسلام قرار پائے گا''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''دار الحرب تصیر دارالاسلام باجراءاحکام اهل الاسلام فیها''(فتاویٰ ابن عابدین شامی ۔ص175،ج4)

''اور دارالحرب میں اہلِ اسلام کے احکامات جاری ہونے سے وہ دارالاسلام میں تبدیل ہو جاتا ہے۔''

امام علاء الدین ابو بکر بن مسعود کاسانی متوفی 587 ھ ،اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”بدائع الصنائع“میں فرماتے ہیں:

”لاخلاف بین اصحابنافی ان دارالکفر تصیر دارالاسلام لظھوراحکام الاسلام فیھا“ (بدائع الصنائع ۔ص130،ج7)

”ہمارے علماء میں اس بات کا کسی میں اختلاف نہیں ہے کہ دارالکفر، دارلاسلام میں تبدیل ہوتا ہے اس میں اسلامی احکام ظاہر ہونے سے۔“

”صارت الدار دارالاسلام بظھوراحکام الاسلام فیھا من غیر شریطۃاخری“ (بدائع الصنائع۔ص131،ج7)

”دارالکفر،دارالاسلام میں تبدیل ہوتا ہے اس میں اسلامی احکام جاری ہونے سے دوسری کسی شرط کے بغیر۔“

دارالحرب سے مراد:

جس طرح دارالحرب کا کوئی بھی علاقہ اس وقت تک دار الاسلام قرار نہیں پاسکتا جب تک اس میں مکمل اسلامی احکام کا اجراء اور ظہور نہ ہوجائے۔اسی طرح کوئی بھی علاقہ جو کہ دار الاسلام کا حصہ ہووہ اس وقت تک دار الحرب میں تبدیل نہیں ہوتاجب تک کہ اس میں کچھ نقائص پیدا نہ ہوجائیں۔چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ”ردالمختار“میں لکھتے ہیں:

((لا تصیردار الاسلام دارالحرب الا بأمور ثلاثۃ باجراء احکام ا ھل الشرك وبا تصالھابدارالحرب، وبان لایبقی فیھا مسلم او ذمی امنا بالامان الاول علی نفسه))(فتاویٰ شامی ،ص174،ج4)

”دارالاسلام دارالحرب میں تبدیل نہیں ہوتا مگر تین چیزوں کے پائے جانے سے:

(۱)........اہل شرک کے احکام جاری ہونے سے اور

(۲)........اس شہر کا دارالحرب سے متصل ہونے سے اور

(۳)........یہ کہ وہاں کوئی مسلمان یا ذمی اپنی ذات اور دین کے اعتبار سے امن اول سے مامون رہے۔"

یہاں اہل شرک سے اہل کفر مراد ہیں یعنی اہل کفر کے احکام علی الاعلان بلا روک ٹوک جاری ہوں ، احکام اسلام وہاں جاری نہ ہوں اور دارالحرب سے متصل ہونے سے مراد یہ ہے کہ دونوں "دار" کے درمیان دار الاسلام کا کوئی اور علاقہ موجود نہ ہو اور امن اول سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کے سبب اور ذمی کو عہدِ ذمہ کی سبب کفار کے غلبے سے پہلے جو امن تھا، وہ امن کفار و مرتدین کے غلبہ کے بعد مسلمان اور ذمی دونوں کے لئے باقی نہ رہے۔ یہ رائے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک مذکورہ امور میں سے صرف ایک ہی امر سے دارالحرب بن جاتا ہے یعنی دارالاسلام میں صرف احکام کفر جاری ہونے سے وہ دارالحرب بن جاتا ہے اور یہی قول فقہ حنفی میں قرین قیاس ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"وقال ابو یوسف رحمۃاللّٰہ علیہ ومحمد رحمۃ اللّٰہ علیہ بشرط واحد لاغیر وھواظھار احکام الکفر وھو القیاس"۔(فتاوی عالمگیری بحوالہ تالیفات رشیدیہ بعنوان "فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب ودار الاسلام"۔ص:667)

"اور امام ابو یوسف اور امام محمد ; فرماتے ہیں کہ صرف ایک شرط محقق ہونے سے دار الحرب کا حکم کر دیا جائے گا اور وہ شرط یہ ہے کہ احکام کفر کو علی الاعلان جاری کر دیں اور قیاس (بھی فقہ حنفی کے نزدیک) اسی کا متقاضی ہے"۔

علامہ سرخسی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی:

''وعن ابي يوسف و محمد رحمهما الله تعالىٰ اذااظهروا احكام الشرك فيها فقد صارت دارهم دار حرب ،لأن البقعة انما تنسب الينا او اليهم باعتبار القوة والغلبة، فكل مقضع ظهر فيها حكم الشرك فالقوة في ذلك الموضع للمشركين فكانت دار حرب وكل موضع كان الظاهر فيه حكم الاسلام فالقوة فيه للمسلمين''(مبسوط سرخسی،ج:12ص:258۔بدائع الصنائع۔ص194،ج7)

''امام ابو یوسف اور امام محمد ;سے منقول ہے کہ اگر دارالاسلام کے کسی علاقہ میں(حکام)احکام شرک کا اظہار کردیں (یعنی علی الاعلان نافذ کردیں)تو ان کا دار، دارالحرب ہو گا۔اس لیے کہ کوئی بھی علاقہ ہماری یاان (کفار) کی جانب قوت اور غلبہ ہی کی بنیاد پر منسوب ہو تا ہے۔ جس جگہ احکام شرک نافذ ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جگہ مشرکین کو اقتدار اور قوت حاصل ہے،اس لحاظ سے وہ ''دار الحرب'' ہے۔اس کے برعکس جس جگہ ''حکم''، اسلام کا ظاہر اور غالب ہو تو وہاں گویا مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے(اور وہ دار الاسلام ہے)''۔

دار الاسلام اور دارالحرب کی شرعی تعریفات جاننے کے بعد ان لوگوں کے شبہات کاازالہ ازخود ہو جاتا ہے کہ جو پاکستان کو دارالاسلام سمجھتے ہوئے اس میں دار الاسلام کے احکامات لاگو کرتے ہوئے یہاں ''قتال فی سبیل اللہ''کو شرعی طور پر ناجائز تصور کرتے ہیں۔جیسا کہ قائد جمعیت بارہا کہہ چکے ہیں کہ:

''ہم پاکستان میں مسلح جہاد کو شرعی طور پر درست نہیں سمجھتے''۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ پاکستان اوّل دن سے کسی صورت بھی ''دار الاسلام''کی تعریف پر صادق نہیں آیا کیونکہ یہاں پر کلی طور پر کبھی بھی احکام اسلامی کا مکمل اجراء ہوا ہی نہیں بلکہ الٹا''آئین ودستور''کے نام پر احکامِ کفرو شرک کا نفاذ ہی بڑھتا چلا جارہا ہے۔لہٰذا آج پاکستان ''دارالحرب''کی تعریف پر

صادق آتا ہے،اور جو جگہ دارالحرب قرار پائے تو اس جگہ کے احکامات یکسر بدل جاتے ہیں اور وہاں احکام اسلامی کے اجراء کے لئے "قتال فی سبیل اللہ "فرض عین ہو جاتا ہے ، جس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔

تیسرا مسئلہ

یہود و نصاریٰ کی مدد و نصرت کرنے والوں کو مسلمان سمجھنا

عصر حاضر میں اقامت دین کے لئے کھڑے ہونے والی اکثر جماعتیں ایک عجیب کشمکش اور مخمصے کا شکار ہیں، وہ یہ کہ وہ مسلمان علاقوں پر حکمرانی کرنے والے طواغیت کو اور ان کی افواج کو مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کی مدد و نصرت کرنے پر بہ بانگ دہل اور علی الاعلان کفار کا ایجنٹ اور ان کا آلہ کار قرار دیتے ہیں لیکن دوسری طرف پھر ان کو مسلمان بھی سمجھتی ہیں اور ان پر مسلمان حکمران کا شرعی حکم لاگو کرتی ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب افغانستان پر روسی جارحیت کے بعد روس نواز حکمران کارمل کو بھی مسلمان قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

> ”کارمل بظاہر مسلمان ہے۔ آج تک نہیں سنا گیا کہ اس کی تکفیر کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ جو افغانی فوج ہے، وہ سب کے سب بہر حال مسلمان ہیں۔ مسلمان ماؤں کا دودھ پیئے ہوئے ہیں........ کتنا دکھ ہوتا ہے جب یہ خبریں آتی ہیں کہ اتنے کارمل فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجاہدین، اسلام کے لئے، حریت کے لئے اور خدا ناآشنا بلکہ خدا دشمن روسی جارحیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کامیابی پر خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں دکھ کا یہ پہلو بھی موجود ہے کہ ہلاک ہونے والے (فوجی) بھی تو مسلمان ہیں“۔ (منہج انقلاب نبوی، ص345)

حالانکہ یہ بات ازروئے شریعت بالکل واضح اور بین ہے کہ مسلمانوں کے خلاف یہود نصاری کی مدد و نصرت کرنے والا دراصل کفار کی ہی خندق میں کھڑا ہونے والا تصور کیا جاتا ہے اور اس کا کلمہ ٹوٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی تکفیر کے موانع یک لخت کالعدم ہو جاتے ہیں اور وہ دائرہ اسلام سے بغیر کسی شک و تردد کے خارج ہو کر ”کافر و مرتد“ ٹھہرتا ہے۔

چنانچہ جس طرح یہ بات جاننا ضروری ہے کہ وضو اور نماز کے نواقض کیا ہیں اس سے بڑھ کر یہ جاننا ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید کے وہ کون سے نواقض ہیں جن کی وجہ ایک شخص کا کلمہ ٹوٹ جاتا ہے۔ سلف وصالحین اور فقہاء کرام کے ہاں دس(10)مشہور بنیادی ''نواقض اسلام''معروف ہیں۔یہ نواقض فقہاء و علماء کی از خود اختراع نہیں بلکہ قرآن و سنت سے ثابت نصوص سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔چنانچہ 'نواقض اسلام''میں آٹھواں یہ ہے کہ:

''آٹھویں بات جس سے آدمی کافر ہو جاتا ہے وہ ہے مشرکوں کی نصرت اور پشت پناہی یا مسلمانوں کے خلاف اُن کا معاون یا حلیف بننا''۔

چنانچہ ہم مختصراً کچھ آیات قرآنی اور ان پر مفسرین کے کلام کو نقل کرتے ہیں جن میں اس موالات کا ذکر ہے جو کہ ''عقیدہ الولاءوالبراء'' سے تعلق رکھتی ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾(سورۃالمائدۃ:51)

''اے اہل ایمان !یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے گا وہ بے شک انہی میں سے ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہرگز ہدایت عطا نہیں فرماتا''۔

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

فانه عنى بذلك: أن بعض اليهود أنصار بعضهم على المؤمنين، ويد واحدة على جميعهم وأن النصارى كذلك، بعضهم أنصار بعض على من خالف دينهم وملتهم معرِّفًا بذلك عباده المؤمنين: أنّ من كان لهم أو لبعضهم وليًا، فانما هو وليهُم على من خالف ملتهم ودينهم من المؤمنين، كما اليهود والنصارى لهم

حَرْب۔ فقال تعالی ذکرہ للمؤمنین:فکونوا أنتم أیضًا بعضکم أولیاء بعض، ولليهودیّ والنصرانی حربًا کما ھم لکم حرب، وبعضهم لبعض أولیاء، لأن من والاهم فقد أظهر لأهل الایمان الحرب، ومنهم البراءة، وأبان قطع وَلایتهم.''

''ہمارے نزدیک یوں کہنا زیادہ مناسب اور درست ہے کہ اللہ رب العزت نے تمام مسلمانوں کو منع کیا ہے۔اس بات سے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا حمایتی، مددگار اور حلیف بنائیں، ان مومنوں کے خلاف جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے آخری رسول جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی خبردار کیا ہے کہ جو مسلمان اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا حمایتی، مددگار اور دوست بنائے گا تو اس کے نتیجے میں وہ ان یہودی اور عیسائی کافروں کی جماعت کا ہی فرد گردانا جائے گا۔ گویا یہ شخص اللہ رب العالمین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کے مدمقابل کافروں کی جماعت کا ایک رکن ہو گا۔اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کلیتاً بیزار اور لاتعلق ہوں گے۔''(تفسیر الطبری:6/277،276)

مشہور مفسر قرآن امام قرطبی رحمہ اللہ سورۃ المائدۃ کی آیت:51 کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قوله تعالی:﴿ومن یتولهم منکم﴾ أی یعضدهم علی المسلمین ﴿فانه منهم﴾ بین تعالی أن حکمه کحکمهم، وهو یمنع اثبات المیراث للمسلم من المرتد، وکان الذی تولاهم ابن أبی ثم هذا الحکم باق الی یوم القیامة فی قطع الموالاة''۔ (تفسیر القرطبی:ج6ص217)

”اللہ تعالیٰ کے فرمان﴿وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ﴾ کا مطلب ہے کہ ”يُعَضِّدُهُمْ عَلَى الْمُسْلِمِيْن“، یعنی جو شخص بھی مسلمانوں کے خلاف کافروں کو قوت، طاقت اور ہر طرح کی (لاجسٹک) مدد فراہم کرتا ہے تو﴿فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ وہ انہی میں سے شمار کیا جائے گا۔ گویا اللہ رب العزت نے بڑی وضاحت سے فرمادیا ہے کہ اس کے ساتھ وہی رویہ برتا جائے گا جو ان یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ برتا جائے گا۔ وہ شخص کسی مسلمان کے مال میں وراثت کا حقدار بھی نہیں ٹھہرے گا نہ اس کے مرنے کے بعد اس کا مال مسلمان وارثوں میں تقسیم ہو گا۔ اس لیے کہ وہ مرتد ہو چکا ہے، یہ بھی ذہن نشین رہے کہ یہ حکم تا قیامِ قیامت جاری وساری ہے۔“

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾(التوبة: 23)

”اے ایمان والو! اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ عزیز رکھیں۔ تم میں سے جو بھی ان سے محبت رکھے گا، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں“۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

”قرآن مجید کی مذکورہ آیت کے آخری حصہ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ کے بارے میں مفسر قرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

((هُوَ مُشْرِكٌ مِثْلُهُمْ ، لِأَنَّ مَنْ رَضِيَ بِالشِّرْكِ فَهُوَ مُشْرِكٌ))

”جو کسی کافر و مشرک سے دوستی کرے گا وہ ان کی طرح کا ہی مشرک ہو گا، اس لیے کہ جو شرک کو پسند کرتا ہے وہ بھی مشرک ہوتا ہے۔“(تفسير القرطبی:8/94-93، تفسير فتح القدير للشوكانی:1/529، تفسير أبي سعود:2/246)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اسلام کا اصول ہے کہ ((الرِّضَاءُ بِالْكُفْرِ كُفْرٌ)) یعنی'' کفر کو پسند کرنا بھی کفر ہے''۔(تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر القرطبی:5/417،418)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((من كثر سواد قوم فهو منهم ومن رضى عمل قوم كان شريك من عمل به))(كنزالعمال،ج:9،ص:22،رقم:24735۔مسندابی یعلی،نصب الرایه:4/346)

''جو شخص کسی گروہ (میں شامل ہو کر ان) تعداد بڑھائے وہ اُن ہی میں سے ہے اور جو کسی گروہ کے عمل پر راضی رہے وہ ان کے عمل میں شریک ہے''۔

فضیلۃ الشیخ سلیمان بن عبد اللہ (آل شیخ رحمہ اللہ) سورۃ محمد کی آیت ۲۶ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

''مقام غور و فکر ہے کہ جب اللہ کی شریعت کو ناپسند کرنے والے کافروں سے بعض باتوں میں اطاعت گزاری کا یقین دلانے والوں کو اللہ رب العزت نے کافر کہا ہے، حالانکہ وہ ابھی صرف زبانی یقین دلا رہے ہیں عملاً کچھ نہیں کر رہے۔ تو جو لوگ اللہ کی نازل کردہ شریعت کو ناپسند کرنے والے مشرکوں سے مکمل طور پر موافقت کرتے ہیں، اطاعت گزاری کا یقین دلاتے ہیں اور عملاً کافروں کے حق میں کاروائیاں بھی کرتے ہیں تو کیا ان کے کافر ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے؟''(الرسالۃ الحادیۃ عشرۃ من مجموعۃ التوحید:346،347)

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾(آل عمران:28)

''مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ اللہ کی حمایت میں نہیں، مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو۔ اور اللہ تعالیٰ خود تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔

مذکورۃ الصدر آیت کی تفسیر میں امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ومعنی ذلك:لا تتخذوا، أيها المؤمنون، الكفارَ ظهرًا وأنصارًا توالونهم على دينهم، وتظاهرونهم على المسلمين من دون المؤمنين، وتدلُّونهم على عوراتهم، فانه مَنْ يفعل ذلك "فليس من الله فی شیئ"،یعنی بذلك: فقد برئ من الله وبرئ الله منهٔ بارتداده عن دينه ودخوله فی الكفر''(تفسير الطبری ج6ص313)

''اس آیت کریمہ کا معنیٰ ومفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو منع کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ کافروں کو اپنا حمایتی اور مددگار نہ بناؤ۔ وہ اس طرح کہ ان کے دین ومذہب کی بنیاد پر ان سے دوستیاں رچانے لگ جاؤ، مسلمانوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے خلاف کافروں کی مدد کرنے کے درپے ہو جاؤ اور کافروں کو مسلمانوں کے خفیہ راز اور معلومات فراہم کرنے لگ جاؤ۔ جو شخص ایسا رویہ اختیار کرے گا ﴿فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ﴾ یعنی اس طرح کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ اس سے لاتعلق ہو جائے گا۔ اس وجہ سے کہ وہ اسلام سے مرتد ہو چکا ہے اور کفر میں داخل ہو چکا ہے۔''

تقیہ کی اصطلاح کا ناجائز استعمال:

بعض نام لوگ مذکورہ بالا آیت میں مذکور الفاظ ''الاان تتقوا'' کی آڑ لیتے ہوئے حکمرانوں کے کے لئے یہ دلیلیں دیتے ہیں کہ ہم تو مجبور ہیں اور یہ کہ ہم تو کافروں کے شر سے بچنے کے لئے اُن کا ساتھ دے رہے ہیں، اور پھر وہ کافروں کے ہم رکاب ہو کر اہل ایمان سے جنگ کرتے ہیں، اُن کا قتلِ

عام کرتے ہیں اور اُن کافروں کے ساتھ ہر طرح کی مدد اور تعاون کرتے ہیں۔" تقیہ "یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اس کی آڑ میں کافروں سے محبت اور دوستی شروع کر دی جائے، یا تقیہ کی آڑ میں کافروں کے کفریہ اور باطل عقائد و نظریات کو اختیار کرنا شروع کر دیا جائے، یا تقیہ کی آڑ لیتے ہوئے کافروں کے پروگراموں، ایجنڈوں، اقدامات (Missions) کو ہی درست قرار دے دیا جائے اور نہ ہی تقیہ کا یہ مطلب ہے کہ کافروں کے اتحادی بن کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شمولیت اختیار کرلی جائے۔ جس شخص نے تقیہ کا یہ مطلب سمجھا ہے، دراصل اس نے دین اسلام میں ایسی بات سمجھی اور کہی ہے جس کا فتنہ و فساد کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ جان لیجئے کہ یہ نظریہ رکھنا قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے چناچہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے:

((لَيْسَ التَّقِيَّةُ بِالْعَمَلِ اِنَّمَا التَّقِيَّةُ بِاللِّسَانِ))(تفسیر ابن کثیر:1/357)

"(اگر کافروں کے شر کے خوف سے) بظاہر دوستی کا اظہار کرنا پڑ ہی جائے تو وہ صرف قول و گفتار کی حد تک ہو، کسی عمل و کردار سے نہ ہو۔"

اسی طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس حوالے سے مزید قول ملتے ہیں:

((اِنَّمَا التَّقِيَّةُ بِاللِّسَانِ))(تفسیر ابن کثیر:1/357)

"تقیہ (کافروں کے کے ساتھ بظاہر دوستی کا اظہار) صرف زبان کی حد تک جائز ہے۔(نہ کہ عملی کاروائیوں سے)"۔

((هُوَ أَنْ يَّتَكَلَّمَ بِلِسَانِهِ وَ قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَ لَا يَقْتُلُ وَ لَا مَأْثَمًا))(تفسیر القرطبی:4/57)

"تقیہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان شخص کفار کے شر سے بچنے کے لیے اپنی زبان سے کوئی ایسی بات کہہ دے جس سے بچاؤ ممکن ہو۔ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ تقیہ کرتے وقت نہ تو کسی مسلمان کو قتل کرنا جائز ہے اور نہ ہی کسی گناہ کا ارتکاب کرنا جائز ہے۔"

عوف اعرابی رحمہ اللہ جناب حسن بصری رحمہ اللہ سے تقیہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

''اَلتَّقِيَّةُ جَائِزٌ لِلْمُؤْمِنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اِلَّا اَنَّهُ كَانَ لَا يُجْعَلُ فِي الْقَتْلِ تَقِيَّةٌ'' (فتح الباری: 12/314، کتاب الاکراہ، الحدیث: 6940)

''تقیہ کرنے کی سہولت اور اجازت مومن کے لیے قیامت تک باقی ہے۔ مگر کسی خونِ ناحق میں تقیہ کرنا جائز نہیں ہے۔''

اہل ایمان کے مدمقابل کفار کی مددونصرت ''بدترین کفر'' ہے:

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اپنے مشہور فتوے میں فرماتے ہیں:

''قتل مسلم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل کو حلال سمجھے اور اس پر نادم اور متاسف نہ ہو، مثلاً کوئی مسلمان فوجی ہو اور وہ یہ سمجھے کہ لڑائی لڑنا ہی ہمارا کام ہے، مسلمان سامنے ہوں گے تو ان ہی سے لڑیں گے۔ یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ یا یوں سمجھے کہ ہمارے مالکوں کا یہی حکم ہے، ہم نے ان کا نمک کھایا ہے اس لئے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ یعنی اگر کوئی اپنا نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کا قتل کر دو (جیسا کہ فی زمانہ ہو رہا ہے) تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، تو اس صورت میں تمام امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ وہ شخص ''قطعاً و حتماً کافر'' ہے۔ یعنی اس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا حکم شرعاً یہی ہو گا جو تمام کفار و مشرکین کا ہے، دنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اس (شخص) کو مسلمان سمجھے اور اُس سلوک کا حقدار کہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔

قتل مسلم کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر ان کی فتح و نصرت کے لئے مسلمانوں سے لڑے یا لڑائی میں ان (کفار) کی اعانت کرے، اور جب

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے۔ یہ صورت اس جرم کے کفر و عدوان کی انتہائی صورت ہے اور "ایمان کی موت" اور اسلام کے نابود ہونے کی ایک ایسی اشد حالت ہے جس سے زیادہ کفر و کافری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے وہ سارے گناہ، ساری معصیتیں، ساری ناپاکیاں، ہر طرح و ہر قسم کی نافرمانیاں جو ایک مسلمان اس دنیا میں کر سکتا ہے یا ان کا وقوع دھیان میں آسکتا ہے، سب اس کے آگے ہیچ ہیں۔ جو مسلمان اس کا مرتکب ہو، وہ قطعاً کافر ہے اور "بدترین قسم کا کافر" ہے۔ اس کی حالت کو قتل مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہو گا۔ اس نے صرف قتل مسلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا، بلکہ اسلام کے خلاف دشمنان حق کی اعانت و نصرت کی ہے، اور یہ بالاتفاق بالاجماع کفر صریح اور قطعی مخرج من الملۃ ہے۔ جب شریعت ایسی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقۂ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتی تو پھر صریح اعانت فی الحرب (جنگ میں مدد و نصرت) اور حمل السلاح علی المسلم (مسلمان پر ہتھیار اٹھانے) کے بعد کیونکر ایمان و اسلام باقی رہ سکتا ہے!"

(قتل مسلم، ص 501 تا 502 از کتاب معارف مدنی، افادات مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، جمع و ترتیب مولانا مفتی عبد الشکور ترمذی)

لہٰذا شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کوئی شخص کسی مسلمان کو "دین اسلام" پر چلنے کی بنیاد پر قتل کر دیتا ہے جیسا کہ عیسائی مسلمانوں سے ان کے دین اور تہذیب کی بنیاد پر ہی جنگ کرتے ہیں، تو ایسا شخص کہ جو محض دین اسلام کی بنیاد پر کسی مسلمان کو قتل کرے وہ "کافر" ہے۔ دین اور تہذیب کی بنیاد پر کسی مسلمان کو قتل کرنے والا کافر، اس کافر سے زیادہ خطرناک ہے جس کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا باہمی عہد و پیمان طے کیا گیا ہو۔ اس قسم کا کافر بالکل ان کافروں کی طرح ہی سمجھا جائے گا جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنگ

وقتال کیا کرتے تھے۔اس قسم کے کفار ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے جس طرح دیگر کافروں کا یہی حکم ہے کہ وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے"۔(مجموع الفتاوی:24/137،136)

تمسك فى الدين کی بنیاد پر قتل کرنے والے کا حکم:

یہاں ضمنی طور پر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا کلام سے ان لوگوں کے شبہات کا بھی رد ہو جاتا ہے جو کہ عصر حاضر کے طواغیت کی جانب سے مسلمانوں کا تمسك فى الدين یعنی "دین اسلام" پر چلنے کی بنیاد پر قتل عام کرنے کے باوجود ان کو مسلمان سمجھتے ہیں۔مثال کے طور پر ماضی بعید میں شام کے سابق صدر حافظ الاسد، مصر کے سابق صدر حسنی مبارک اور ماضی قریب میں پرویز مشرف اور آصف زرداری سمیت دیگر کی جانب سے دین پر چلنے کی پاداش میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے باوجود اُن کو مسلمان قرار دینا۔جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

"آج اسلامی تحریکوں کا راستہ روکنے والے کوئی اور نہیں خود مسلمان ہیں۔نظام خلافت کے برپا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی مسلمان ہیں۔مصر میں حسنی مبارک مسلمانوں کے ساتھ،شام میں حافظ الاسد اخوان کے ساتھ، اسی طرح الجزائر میں مسلمان فوجی اسلامی تحریک کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ہمارے ملک میں نظام مصطفےٰ کی تحریک پر گولیاں چلانے والے بھی مسلمان ہی تھے"۔(خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام،ص194)

کیا وہ شخص جو کہ مسلمان ہونے کے باوجود نظام خلافت کے قیام میں نہ صرف رکاوٹ بن جائے بلکہ جو لوگ بھی اس کام کو کرنا چاہیں ان کا وہ قتل عام کرے(جیسا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے طلبہ وطالبات اور اہل سوات کا 'شریعت کے نفاذ" کے مطالبے کی وجہ سے قتل عام کرنا)تو کیا ایسے شخص کے

کفر میں کوئی شک رہ جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کا شرعی حکم وہی ہے جو کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ:

" اس قسم کا کافر بالکل ان کافروں کی طرح ہی سمجھا جائے گا جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنگ و قتال کیا کرتے تھے۔اس قسم کے کفار ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے جس طرح دیگر کافروں کا یہی حکم ہے کہ وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے "۔(مجموع الفتاوی:24/137،136)

چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کا حکم یہ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ،اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾(آل عمران:21-22)

"جو لوگ اللہ کے احکام وہدایت کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں عدل وقسط کا حکم دینے کے لئے کھڑے ہوں،تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہوگئے،اور ان کا کوئی مددگار نہیں"۔

چوتھا مسئلہ: الحکم بغیر ما انزل اللہ

الحکم بغیر ما انزل اللہ کے حکومت کرنے والے طواغیت کو مسلمان سمجھنا

ایک مغالطہ جو ظلم و فسق اور کفر وارتداد کے درمیان فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے واقع ہو جاتا ہے، وہ ہے ''الحکم بغیر ما انزل اللہ کے حکومت کرنے والے طواغیت کو مسلمان سمجھنا''۔ اور یہی وہ مغالطہ ہے جو کہ آج مسلمانوں کے سروں پر مسلط الحکم بغیر ما انزل اللہ کے حکومت کرنے والے طواغیت کے اقتدار کو سند جواز عطا کرنے میں سب سے بڑا معاون ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایسے حاکم کے بارے میں حکم شرعی جاننا اشد ضروری ہے جو کہ اللہ کے نازل کردہ شریعت کو معطل کر کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کو رائج کرے۔

چنانچہ اب تک ہم نے جن مباحث پر سلف و صالحین کا کلام نقل کیا وہ اس بات سے متعلق تھا کہ جس میں ''نظام خلافت'' اپنی جگہ قائم تھا مگر فرق صرف یہ تھا کہ حاکم وقت سے فسق و فجور یا کفر وارتداد کا ظہور ہو جائے۔ لیکن اس سے بڑی مصیبت جس میں امت مسلمہ دورِ حاضر میں مبتلا ہے، وہ یہ کہ ایک صدی گزر گئی اور 'نظام خلافت'' موجود ہی نہیں ہے۔ گو کہ یہی بہت بڑی مصیبت تھی کہ خلافت کا نظام موجود نہیں مگر دوسری طرف اس سے بڑی مصیبت امت مسلمہ پر ایسے حکمرانوں کا مسلط ہو جانا ہے ،جن کا اپنی ذات میں ''کفر بواح'' کا ظہور اپنی جگہ ،وہ معصیت سے بڑھ کر صریح کفریہ قوانین کو اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مقابلے میں ''آئین و دستور'' کے نام پر جاری کر رہے ہیں اور لوگوں کو اس پر عمل پر مجبور کر رہے ہیں اور جو کوئی اس پر عمل نہ کرے اس کو سزا دیتے ہیں اور جو کوئی اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اس کو تہہ تیغ کر دیتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اپنے قوانین کو یہود و نصاریٰ کے قائم کردہ عالمی طاغوتی نظام (U.N.O) کے تابع کر دیا ہے۔ تو جو کوئی حاکم ایسا کرے تو

از روئے شریعت وہ "طاغوت" قرار پاتا ہے جس کی اطاعت کسی صورت جائز نہیں بلکہ اس کا کفر کرتے ہوئے اس کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

طاغوت کی تعریف:

چنانچہ اب ہم "طاغوت" کی قرآنی اصطلاح کو بھی سمجھ لیں، جس سے انکار اور برأت کرنے کا حکم خود اللہ رب العزت نے دیا ہے:

﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لا انْفِصَامَ لَهَا﴾ (البقرة : 256)

"جس نے طاغوت کا کفر کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا تو اس نے مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔"

چنانچہ اس حکم قرآنی کے بارے میں امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وهذاهو معنىٰ لا اله الا الله'' (الاصول الثلاثة:ص55، للشيخ محمد بن سلمان التميمى رحمه الله)

"اور یہی معنی ہے لا الہ الا اللہ کے"

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وافترض الله على جميع العباد ،الكفر باالطاغوت والايمان بالله'' (الاصول الثلاثة وادلتها:ص51، للشيخ محمد بن سلمان التميمى رحمه الله)

"فرض قرار دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمام بندوں پر یہ کہ وہ طاغوت کا کفر کریں اور اللہ پر ایمان لائیں"۔

اور ہر رسول کا مقصدِ بعثت بھی یہی ہوتا تھا کہ:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾(النحل:36)
"اور تحقیق ہم نے ہر قوم میں رسول کو (اس بات سے خبردار کرنے لئے) بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے بچو"۔

چنانچہ اب ہم مختصر طور پر یہ بھی سمجھ لیتے ہیں کہ سلف صالحین اور فقہاء کرام نے اس لفظ "طاغوت" سے کیا سمجھا ہے اور کس پر انہوں نے اس لفظ کا اطلاق کیا؟ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا:

"طاغوت ہر اس معبود، یا پیشوا، یا واجب اطاعت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے بندہ اپنی حد سے تجاوز کر جائے۔ لہٰذا ہر قوم کا "طاغوت" وہ ہوا جس کے پاس وہ اللہ اور اس کے رسول کے سوا فیصلے کے لیے جاتے ہیں، یا اللہ کے سوا اس کی عبادت کرتے ہیں، یا اللہ کی جانب سے بلا بصیرت اس کی اتباع کرتے ہیں، یا اس کی اس بات میں اطاعت کرتے ہیں جس کے متعلق وہ نہیں جانتے کہ وہ اللہ کی اطاعت ہے"۔ (اعلام الموقعین عن رب العالمین: 1/50)

سلیمان بن عبد اللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ "طاغوت" انسان کی صورت میں شیطان ہوتا ہے جس کے پاس لوگ تنازعات کے فیصلے لیجاتے ہیں۔" (تیسیر العزیز الحمید:49)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اسی لئے ہر حاکم جو کتاب اللہ کے بغیر فیصلہ کرتا ہو اسے طاغوت کہا گیا ہے"۔ (مجموع الفتاویٰ:20/128)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''والطواغيت كثيرون، ورؤسهم خمسة: ابليس لعنه الله، ومن عبد وهو راض، ومن دعاالناس الى عبادة نفسه ، ومن ادعى شيئاً من علم الغيب، ومن حكم بغير ما انزل الله'' (الاصول الثلاثة وادلتها: ص51، للشيخ محمد بن سلمان التميمى رحمه الله)

''طاغوت تو بے شمار ہیں مگر ان کے چوٹی کے سردار پانچ ہیں:
1۔ ابلیس لعین
2۔ ایسا شخص جس کی عبادت کی جائے اور وہ اس فعل پر رضامند ہو۔
3۔ جو شخص لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت دیتا ہو اگرچہ اس کی عبادت نہ بھی ہوتی ہو۔
4۔ جو شخص علم غیب جاننے کا دعویٰ کرتا ہو۔
5۔ جو شخص اللہ کی نازل کی ہوئی شریعت کے خلاف فیصلہ کرے''۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ سورۃ النساء کی آیت 60 کی تفسیر میں ایک منافق کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کئے گئے فیصلہ کو تسلیم نہ کرتے ہوئے یہودی سردار کعب بن اشرف کی طرف رجوع کرنے پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس کی گردن اتارنے کا واقعہ ''روح المعانی'' میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول روایت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لفظ ''طاغوت'' کے لغوی معنی سرکشی کرنے والے کے ہیں اور عرف میں شیطان کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں کعب بن اشرف کی طرف مقدمہ لے جانے کو، شیطان کی طرف لے جانا قرار دیا ہے، یا تو اس وجہ سے کہ کعب بن اشرف خود ایک شیطان تھا، اور یا اس وجہ سے کہ شرعی فیصلہ چھوڑ کر خلافِ شرع فیصلہ کی طرف رجوع کرنا شیطان ہی کی

تعلیم ہو سکتی ہے، اس کی اتباع کرنے والا گویا شیطان ہی کے پاس اپنا مقدمہ لے گیا ہے"(معارف القرآن، جلد دوم، ص458،457)

خود سید ابوالاعلیٰ مودودی اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یہاں صریح طور پر "طاغوت" سے مراد وہ حکام ہیں جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور وہ "نظام عدالت" ہے جو نہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ کتاب اللہ کو آخری سند مانتا ہو"۔(تفہیم القرآن:ص:367)

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"پس جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کی مخالفت اس طرح کرتا ہے کہ وہ کتاب وسنت کے علاوہ کسی اور جگہ سے فیصلہ کراتا ہے یا اپنی خواہشات کی تکمیل میں مگن ہے تو گویا اس نے عملاً ایمان اور اسلام کی رسی کو گردن سے اتار پھینکا۔ اس کے بعد خواہ وہ کتنا ہی ایمان کا دعویٰ کرے بے کار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "طاغوت کا انکار کرنا" توحید کا سب سے بڑا رکن ہے۔ جب تک کسی شخص میں یہ رُکن نہ ہو گا وہ موحد نہیں کہلا سکتا"۔(ھدایۃ المستفید:1223)

سلف وصالحین اور مفسرین کے درجِ بالا اقوال سے یہ بات متفقہ طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ "طاغوت" سے مراد ہر وہ شخص یا ادارہ ہے جو الحکم بغیر ما انزل اللّٰہ یعنی اللہ کے نازل کردہ شریعت کو چھوڑ کر اپنے وضع کردہ یا کسی اور کے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرے اور اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرے۔

الحکم بغیر ما انزل اللہ کے حکومت کرنے والے کا حکم:

لہٰذا جو شخص یا ادارہ یا گروہ اللہ کے نازل کردہ شریعت کو چھوڑ کر اپنے وضع کردہ یا کسی اور کے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرے تو اس کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول نے کیا فیصلہ دیا ہے ؟ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾

''جو اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ تو کافر ہیں۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

''جو اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ تو ظالم ہیں''

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

''جو اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ تو فاسق ہیں۔''(سورۃ المائدۃ:44،45،47)

لیکن کچھ لوگ اس آیت کے حوالے سے بعض سلف کے اقوال کو اُن کے اپنے مقام سے پھیر کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص چاہے وہ کتنا ہی الحکم بغیر ما انزل اللّٰہ کے ساتھ حکومت کرتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کی دھجیاں بکھیر دے، اس کے باوجود وہ مسلمان رہے گا اور اس کی اطاعت واجب رہے گی۔ اس کی دلیل میں وہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول(کفر دون کفر) پیش کرتے ہیں جو کہ ایک طرف ضعیف بھی ہے اور دوسری طرف دراصل ''خوارج'' کے اس باطل استدلال اور غلط فہمی کا رد بھی ہے جو کہ خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنے باہمی تنازعات واختلافات کے فیصلے کے وقت اختیار کر لیا تھا۔

چنانچہ سند صحیح سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی قول ثابت ہے کہ انہوں نے الحکم بغیر ما انزل اللّٰہ کو ''کفر مطلق'' کہا ہے۔ عبد اللہ بن طاؤس رحمہما اللہ روایت کرتے ہیں کہ:

کسی نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ”جو اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ تو کافر ہیں۔“ کے بارے میں سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ھی کفر ”یہی کفر ہے“۔ دوسرے جگہ الفاظ ہیں ھی بہ کفر ”یہی تو اللہ کے حکم کا کفر ہے“ ایک اور جگہ ان کے الفاظ ہیں کفی بہ کفر ”یہی عمل اس کے کفر کے لئے کافی ہے“۔

اس روایت کو عبد الرزاق رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اور اامام ابن جریر طبریرحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اور وکیع نے اخبار القضاۃ میں اس کو ذکر کیا ہے۔

اس بات کی تائید سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے بھی ہوتی ہے:

”عن مسروق قال کنت جالسا عند عبد اللہ فقال لہ رجل ماالسحت؟قال الرشا، فقال فی الحکم؟قال ذاك الكفر، ثم قرأ: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾۔“

(مسند ابی یعلیٰ، ج:11ص:29رقم:5143۔مجمع الزوائد، ج:4ص:199۔المعجم الكبير الطبرانی، ج:8ص:153 رقم:9000۔شعب الایمان للبيهقی، ج:11ص:482رقم:5262۔السنن الكبرىٰ للبيهقی، ج:10ص:139الابانة الكبرىٰ لابن بطة، ج:3ص:125)

” مسروق سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں میں بیٹھا ہوا تھا حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس تو ایک شخص نے اِن سے پوچھا السحت “سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ”رشوت“۔ پوچھنے والے نے کہا کہ اس کے ساتھ تحکیم کرنا کیسا ہے؟ فرمایا: ”فیصلہ کرنا ہی تو کفر ہے“ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ”جو کوئی اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ تو کافر ہیں“۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ:

’’عن علی(رضی اللّٰہ عنہ)انہ سئل عن السحت؟فقال الرشاء فقیل لہ فی الحکم قال ذاك الکفر‘‘۔(کنز العمال،ج:2ص:406)

’’حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ السحت‘‘ سے کیا مراد ہے ؟ انہوں نے کہا کہ رشوت۔ اس نے کہا کہ اس کے ساتھ حکم کرنا کیسا ہے ؟ فرمایا’’ یہ کفر ہے‘‘۔

شیخ عبد اللہ بن حمید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’جس نے لوگوں پر کوئی ایسا قانون بنا کر نافذ کیا جو اللہ کے حکم سے متعارض ہو تو ایسا کرنے والا امت سے خارج ہے اور کافر ہے‘‘(نقل عن کتاب الایمان ومبطلاتہ فی العقیدہ الاسلامیۃ)

مشہور سعودی عالم دین شیخ محمد الصالح العثیمین رحمہ اللہ کہتے ہیں:

’’جس نے اللہ کی شریعت کو حقیر و معمولی سمجھ کر اس کے مطابق حکومت نہیں چلائی یا یہ عقیدہ رکھا کہ دوسرے نظریات و قوانین اسلام کی بنسبت زیادہ مفید اور موجودہ دور کے موافق ہیں، تو ایسا شخص کافر ہے، دین اسلام سے خارج ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو خلاف اسلام قوانین بناتے ہیں اور لوگوں کو ان پر عمل کی تاکید کرتے ہیں۔ یہ لوگ شریعت کو چھوڑ کر خود اس لئے قوانین بناتے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ شریعت سے زیادہ مفید اور حالات کے لئے موزوں ہیں۔ یہ ہم اس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ ایک طریقہ چھوڑ کر دوسرا طریقہ تب اپناتا ہے جب وہ اسے پہلے والے سے بہتر نظر آتا ہو یا پہلے والے میں کوئی نقص یا سقم نظر آیا ہو۔‘‘ (المجموع العیشمین ص 1/61)

مشہور سلفی عالم دین شیخ امین اللہ پشاوری حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ شخص جسے مکمل قدرت و اختیار حاصل ہو، اللہ نے اسے حکومت و اقتدار بخشا ہو اور اگر وہ چاہے تو ایک دن کے اندر اندر تمام حکومتی عہدیداروں کو معزول کر دے......... پھر اس کے باوجود وہ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہ کرے، نہ اس بارے میں سوچے ،نہ اس کے لئے سعی کرے اور اُلٹا انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق لوگوں پر حکومت کرے، اگرچہ وہ بالکلیہ شریعت سے متصادم ہوں یا ان کی اکثریت خلافِ شرع ہو ....کچھ شک نہیں کہ ایسا کرنے والا شخص کافر و مرتد ہے اور اسلام سے خارج ہے۔ ان کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان صادق آتا ہے کہ :((حتی تروا منھم کفراً بواحاً)) یعنی "بلا شبہ یہ شخص کفر بواح کا مرتکب کافر ہے اور اس کو توبہ کی دعوت دینے کے بعد قتل کر ڈالنا واجب ہے"۔(فتاویٰ الدین الخالص، المجلد 2، ص:163)

بلاد اسلامیہ پر مسلط طواغیت کی جانب سے (خاص کر پاکستان اور سعودی عرب میں) صرف ان شرعی قوانین کے نفاذ کی وجہ سے (جو کہ ان کے مفادات سے نہ ٹکراتے ہوں یا پھر ان کے ذریعے اپنے اقتدار کا تحفظ کیا جاسکتا ہو) بعض لوگ ایسے حکمرانوں کو نہ صرف مسلمان سمجھتے ہیں بلکہ ان کے لئے "حفظہ اللہ "اور "یرفعہ اللہ "جیسے القابات استعمال کرتے ہیں چاہے وہ حکمران بقیہ اسلامی قوانین کی دھجیاں بکھیر دیں جیسے کہ مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کی مدد و نصرت کرنا یہاں تک کہ سرزمین عرب میں ان کو فوجی اڈوں کی صورت میں تمکن عطا کرنا۔ چنانچہ اس حوالے سے شیخ امین اللہ پشاوری حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

''ولا شك أن من لم يحكم بشيئ مماأنزل الله تعالى لا يكون الاغير مصدق ولانزاع في كفره۔أقول: فتدبر في ہذالتفسير أن الذی لايحكم بجميع ماأنزل الله كافر باجماع المسلمين، ولايغرنك بعض القوانين الاسلامية في بلاد الاسلام فانها ماأقيمت لأنها شرع الله بل لموافقتها قوانين الاوروبين والكافرين، فلاتنس هذا''۔(فتاویٰ الدین الخالص: المجلد 6)

”میں کہتا ہوں کہ: آیت مبارکہ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ کی اس تفسیر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جو شخص ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہ کرے، اس کے کافر ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ پس کہیں یہ بات آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے کہ آج مسلم خطوں میں بعض اسلامی قوانین بھی تو نافذ ہیں۔ یاد رکھئے! یہ قوانین اس لئے نہیں نافذ کئے گئے کہ اللہ کی شریعت نے ان کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے، بلکہ انہیں اس لئے برداشت کیا گیا ہے کہ اہل یورپ اور کفار کے قوانین میں بھی ان کی گنجائش موجود ہے۔ پس یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین رہنا چاہیے!“

چنانچہ عظیم محدث امام ابو یعقوب بن اسحاق حنظلی رحمہ اللہ جو ” ابن راہویہ“ کے نام سے مشہور ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پایا کے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں:

”اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جس نے اللہ کو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی یا ”مَا اَنْزَلَ اللّٰہ “ اللہ کے نازل کردہ دین میں سے کسی حکم کو رد کر دیا یا کسی نبی کو قتل کیا ہو گا اگرچہ وہ ”مَا اَنْزَلَ اللّٰه “(اللہ کی شریعت) کا اقرار بھی کر رہا ہو پھر بھی وہ کافر ہے۔“(الصارم المسلول بحوالہ اکفار الملحدین، ص332، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)

چنانچہ سلف وصالحین اور فقہاء کرام کے معروف دس(10)”نواقض اسلام“ یعنی وہ عقائد وافعال جن کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس میں چوتھا یہ ہے کہ:

”جو شخص یہ سمجھے کہ کوئی ہدایت یا قانون نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور شریعت و قانون سے جامع تر یا مکمل تر ہے یا یہ کہ کسی اور کا حکم و قانون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و قانون سے بہتر ہے مثلاً وہ شخص جو طاغوتوں کے حکم و قانون کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون پر ترجیح دے، تو ایسا شخص کافر ہے“۔

کیا آج بلادِ اسلامیہ پر حکومت کرنے والے طواغیت کی اکثریت کے اندر یہ "نواقض" بدرجۂ اتم نہیں پایا جاتا۔ مگر افسوس ہے ان لوگوں کی عقل و فراست پر کہ جو ان طواغیت کو اب بھی مسلمان ثابت کرنے بلکہ اُن پر "خلیفۃ المسلمین" کے احکامات لاگو کرنے پر بضد ہیں۔ حالانکہ یہ فعل اس لحاظ سے انتہائی خطرناک ہے کہ کوئی بھی ایسا شخص جس کا قول و فعل کفر وارتداد پر مبنی ہو، اس کے کفر میں شک کرنا اور اس کو مسلمان سمجھنا، ایک مسلمان کو خود دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ امام العصر حضرت انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جو شخص کسی قطعی اور یقینی کافر کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے۔" (اکفار الملحدین، ص283)

چنانچہ آپ رحمہ اللہ اپنے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:

ومن لم یکفر منکریها فانه
یجُرّ لها الانکار یستویان

"اور جو کوئی ضروریاتِ دین کے منکر کو کافر نہ کہے، وہ اس انکار کو خود اپنے سر لیتا ہے، اور بغیر کسی فرق و امتیاز کے خود "کافر" ہو جاتا ہے"۔ (اکفار الملحدین: ص307)

"ضروریاتِ دین" کی تعریف کرتے ہوئے امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ضروریاتِ دین سے (مراد) وہ تمام قطعی اور یقینی امورِ دین ہیں جن کا دین رسول اللہ سے ہونا قطعی طور پر معلوم ہے اور حد تواتر و شہرتِ عام تک پہنچ چکا ہے، حتی کہ عوام کا وہ بھی طبقہ جو دین سے کوئی تعلق رکھتا ہو ان کو دین رسول اللہ جانتا اور مانتا ہو۔ مثلاً توحید، نبوت، ختم نبوت، حیات بعد الموت، جزاو سزائے اعمال، نماز اور زکوٰۃ کا فرض ہونا، شراب اور سود وغیرہ کا حرام ہونا۔" (اکفار الملحدین، ص65، 66)

وہ لوگ جن کے پاس عصر حاضر کے طواغیت کے اقتدار کو بچانے اور ان کو مسلمان قرار دینے کے لئے کوئی دلیل باقی نہیں بچتی تو پھر وہ یہ باطل مؤقف اپناتے ہوئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ:

''ٹھیک ہے کہ ان حکمرانوں کے کفر میں کوئی شک نہیں، مگر جب تک ان پر حجت تمام نہ ہو جائے تو اس وقت تک نہ ان کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف قتال کیا جاسکتا ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی شریعت کا حکم بالکل واضح ہے۔ چنانچہ دو وجوہات کی بناء پر اس قسم کے اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ اول یہ کہ جب کسی حاکم کا کفر، ''کفر بواح'' کے درجے کو پہنچ گیا ہو اور وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو گیا ہو، دوم یہ کہ وہ اپنے لشکر کی وجہ سے ایک طائفہ ممتنعہ کی صورت اختیار کر گیا ہو تو پھر شریعت کی روشنی میں اس پر حجت کا تمام ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ شریعت میں اُن آحکام و قوانین کے بارے میں جو کہ نص قطعی سے ثابت ہوں اور ان کے بارے میں ایک کافر بھی اسلام کا حکم جانتا ہو جیسے کہ شراب یا سود کی حرمت کے باوجود اس کو حلال جاننا، تو ایسے شخص کے بارے میں اتمامِ حجت کے قاعدے کو شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ یوں بیان کرتے ہیں:

((من بلغه القرآن فقد قامت عليه الحجة))

''جس تک قرآن پہنچ گیا، اس پر حجت تمام ہو گئی۔''

شیخ عبد اللہ بن عبد اللطیف رحمہ اللہ اور شیخ ابراہیم بن سلیمان بن سمحان رحمہ اللہ آل شیخ فرماتے ہیں:

''مشرکین کی طرف داری اور دفاع کرنے والا کہتا ہے کہ یہ لوگ حجت کو نہیں سمجھ سکے ہیں (اس لیے انہیں کافر نہ کہا جائے) یہ بات اس شخص کی لاعلمی کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اس نے حجت سمجھنے اور حجت پہنچنے میں فرق نہیں کیا، حجت سمجھنا ایک الگ چیز ہے اور حجت پہنچنا

علیحدہ بات ہے، کبھی اس پر بھی حجت قائم ہوتی ہے جو اسے سمجھ نہ سکا ہو؟'(الدرر السنیۃ:10/433)

الحکم بغیر ماانزل اللہ کے حکومت کرنے والے طواغیت کو بدلنے کا شرعی طریقہ:

چنانچہ سلف وصالحین اس بات پر متفق ہیں کہ جو گروہ بھی بغیر ماانزل اللہ کے ساتھ حکومت کرے اور دین اسلام کے مقابلے میں اپنا ایک نظام اور اس کے مطابق قوانین وضع کرے اور وہ ہو بھی اتنا طاقتور کہ وہ اپنی ایک فوج رکھتا ہو تو اس کے خلاف ''قتال'' فرضِ عین ہو جاتا ہے۔

لہٰذا عصر حاضر میں بلاد اسلامیہ پر مسلط طواغیت کے خلاف،اوروہ عالمگیر طاغوتی نظام (U.N.O) جس کے وہ تابعدار ہیں، اس کے انہدام کے لئے قتال امت مسلمہ پر ان کی دوصفات کی بنیاد پر ''فرض عین'' ہو گیا ہے۔ وہ دوصفات یا اسباب درج ذیل ہیں:

(۱)طائفہ ممتنعہ (۲)عدوّصائل

(۱)طائفہ ممتنعہ:

شرعی اصطلاح میں اس مراد وہ گروہ ہے جو کہ ''ضروریات دین'' میں سے کسی ایک کا بھی انکاری ہو یا کسی حرام کام کے ارتکاب پر مصر ہو اور ساتھ ہی وہ اتنی قوت وشوکت بھی رکھتا ہو کہ باقائدہ جنگ کئے بغیر اسے ان شرعی احکامات کے پابندی پر مجبور نہ کیا جاسکے۔ علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ ایسے گروہوں کے خلاف قتال کرنا واجب ہے، یہاں تک کہ وہ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کی پابندی قبول کرلیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''طائفہ ممتنعہ'' کی سزا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عِقَابُ الطَّائِفَةِ الْمُمْتَنِعَةِ كَالَّتِي لَا يُقْدَرُ عَلَيْهَا إِلَّا بِقِتَالٍ. فَأَصْلُ هَذَا هُوَ جِهَادُ الْكُفَّارِ أَعْدَاءِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَكُلُّ مَنْ بَلَغَتْهُ دَعْوَةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى دِينِ اللَّهِ الَّذِي بَعَثَهُ بِهِ فَلَمْ يَسْتَجِبْ لَهُ؛ فَإِنَّهُ يَجِبُ قِتَالُهُ﴿حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾''۔(مجموع الفتاویٰ:ج6ص395)

''طائفہ ممتنعہ یعنی وہ گروہ ہے جس کے خلاف قتال کئے بغیر اس پر قدرت پانا ممکن نہ ہو۔ایسے گروہ کے خلاف قتال کا حکم کفار کے خلاف جہاد کے شرعی حکم ہی پر مبنی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی دعوت پہنچ جائے اور وہ اُسے (جزوی یا کلیۃً) قبول نہ کرے تو اس کے خلاف قتال واجب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کے لئے خالص ہو جائے''۔

(۲)عدوّصائل:

شریعت کی اصطلاح میں اس مراد وہ دشمن ہے جو کہ اُن ''ضروریات خمسہ''(پانچ بنیادی ضروریات) پر حملہ آور ہو جائے جس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو نازل فرمایا ہے۔ ضروریات خمسہ پانچ ہیں:

(۱) دین

(۲) جان

(۳) عزت/نسل

(۴) عقل

(۵) مال

”ضروریات خمسہ“ ایک شرعی اصطلاح ہے جس کو فقہاء کرام نے احادیث مبارکہ کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ضروریات خمسہ“ کے دفاع میں مارے جانے والے کو شہید قرار دیا ہے:

((مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ أَهْلِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دِينِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دَمِهِ فَهُوَ شَهِيد))۔

(النسائی، ج: 12 ص: 465 رقم: 4027۔ مسند احمد، ج: 4 ص: 76 رقم: 1565۔ وابوداؤد، ج:12 ص:388 رقم:4142۔ الترمذی، ج:5 ص:315 رقم:1341 و قال الترمذی :حديث حسن صحيح)

”جو شخص اپنے مال کے دفاع کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، جو اپنے دین کا تحفظ کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، جو اپنا جان بچاتے ہوئے مار گیا وہ شہید ہے اور جو اپنے اہل خانہ کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے“۔

درج بالا حدیث میں چار چیزوں کا ذکر ہے جبکہ ایک اور حدیث میں پانچویں چیز کا ذکر یوں ہے:

((مَنْ قُتِلَ دُونَ مَظْلَمَتِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ))

(سنن النسائی، ج:12، ص:461 رقم:4025۔ مسند احمد، ج:6 ص:175 رقم:2643)

”جو شخص اپنے حق کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے“۔

ضروریاتِ دین میں فقہاء کرام کی قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کردہ ترتیب کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس ترتیب کے مطابق دین کی حفاظت جان، عزت، عقل اور مال سب پر مقدم ہے۔ اس لئے اگر دشمن حملہ آور ہو جائے اور دین داؤ پر لگ جائے تو شریعت یہی حکم دیتی ہے کہ دفاع دین کی خاطر اپنا سب کچھ، حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کر دی جائے، اور یہ تجزیہ اور بحث و مباحثہ کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے کہ قتال کرنے سے فائدہ زیادہ ہو گا یا نقصان، کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دین کے

نقصان سے بڑا اور کوئی نقصان نہیں۔ اسی ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ ”عدوّ صائل“ کے خلاف دفاعی جہاد فرض عین نہیں بلکہ ”اہم ترین فرض عین“ ہے۔

عصر حاضر کے طواغیت بطور طائفہ ممتنعہ:

امت مسلمہ پر مسلط عصر حاضر کے طواغیت نہ صرف اکثر ”ضروریات دین“ اور محرمات کی حرمت کے انکاری ہیں بلکہ انہوں نے عالمگیر طاغوتی نظام کے اصول و ضوابط کے مطابق اپنا اپنا ایک نظام وضع کیا ہوا ہے اور ان کے ساتھ ایک اپنی قوت نافذہ افواج کی شکل میں موجود ہے اور اگر ان افواج کی ناکامی کی صورت میں ان طواغیت یا ان کے نظام حکومت کو خطرہ لاحق ہو جائے تو پھر وہ عالمگیر طاغوتی نظام جس کے چارٹر کے آگے ان طواغیت نے سر تسلیم خم کیا ہوا ہے، اپنی ”امن افواج“ کو ”قیام امن“ کے نام پر حرکت میں لے آتا ہے۔ چنانچہ یہ طواغیت ان وجوہات کی بناء پر ”طائفہ ممتنعہ“ کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور ان کے خلاف قتال ”فرض عین“ ہو چکا ہے۔

محترم جناب مفتی شفیع رحمہ اللہ، سورۃ المائدۃ کی آیت 54 کی روشنی میں اللہ کی نازل کردہ شریعت کے احکامات کا انکار کرنے والوں کے خلاف قتال کے حوالے سے سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک خطبہ کو نقل کرتے ہیں:

> ”جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دئے ہوئے احکام و قوانین اور قانونِ اسلام کا انکار کریں، تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں، اگر میرا مقابلہ پر وہ تمام جن وانس اور دنیا کے شجر و حجر سب کو جمع کر لائیں، اور کوئی میرا ساتھی نہ ہو، تب بھی میں تنہا اپنی گردن سے اس جہاد کو انجام دوں گا۔“ (معارف القرآن، جلد سوم، ص176)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَفِيهِ وُجُوب قِتَال مَانِعِي الزَّكَاةَ أَوْ الصَّلَاة أَوْ غَيْرهمَا مِنْ وَاجِبَات الْإِسْلَام قَلِيلًا كَانَ أَوْ كَثِيرًا لِقَوْلِهِ رَضِيَ اللَّه عَنْهُ :لَوْ مَنَعُونِي عِقَالًا أَوْ عَنَاقًا ''(شرح النووی رحمہ اللہ علی مسلم،ج1ص94رقم:32)

''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو (ممتنع) گروہ بھی زکوٰۃ، نماز یا واجبات اسلام میں سے کسی بھی چھوٹے بڑے واجب کی ادائیگی سے انکار کرے تو اس سے لڑنا واجب ہے کیونکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر یہ لوگ ایک رسی یا ایک بکری کا بچہ بھی ادا کرنے سے انکار کریں (تو میں اس پر بھی ان کے خلاف قتال کروں گا)''۔

علامہ ابن ابطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''قال المهلب: وانما قاتل أبو بكر الصديق الذين منعوا الزكاة؛ لأنهم امتنعوا بالسيف، ونصبوا الحرب للأمة۔ واجمع العلماء أن من نصب الحرب فى منع فريضة، أو منع حقا يجب عليه لآدمى أنه يجب قتاله، فان أبى القتل على نفسه فدمه ہدر''(شرح صحیح البخاری لابن بطال:ج16ص124)

''مہلب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف اسی لئے قتال کیا تھا کہ انہوں نے تلوار کے زور پر زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا اور اس کی خاطر امت سے جنگ پر بھی آمادہ ہوگئے، اور اس بات پر تو علمائے کرام کا اجماع ہے کہ جو شخص کسی فریضے کی ادائیگی یا کسی شخص کے حق کی ادائیگی سے انکاری ہو اور اس پر اڑے رہنے کی خاطر جنگ کے لئے بھی تیار ہو تو اس کے خلاف قتال کرنا فرض ہے۔ پھر اگر وہ اس لڑائی میں مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں ہوگا''۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ صرف نماز یا زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکاری کے خلاف قتال نہیں کیا جائے گا بلکہ یہاں اس سے مراد تمام اوامر و نواہی ہیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ سورۃ التوبہ کی آیت 5 کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''ولهذا اعتمد الصديق، رضى الله عنه،في قتال مانعى الزكاة على هذه الآية الكريمة وأمثالها، حيث حرمت قتالهم بشرط هذه الأفعال، وهى الدخول فى الاسلام ، والقيام بأداء واجباته۔ ونبه بأعلاها على أدناها''۔(تفسير ابن كثيرج 4ص11)

''ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف قتال کے لئے اس آیت مبارکہ اور اس جیسی دیگر آیات کو بنیاد بنایا تھا، کیونکہ ان میں قتال کی حرمت چند افعال سے مشروط کی گئی ہے۔ یعنی جب کوئی شخص اسلام میں داخل ہو جائے یعنی اور واجبات اسلام کی پابندی قبول کر لے تو اس کے خلاف قتال جائز نہیں رہتا (ورنہ بصورت دیگر قتال فرض عین ہے)۔ اس آیت میں (اسلام کے) اہم ترین واجبات (یعنی نماز اور زکوٰۃ) کا تذکرہ کر کے واجباتِ اسلام ہی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے''۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''الْأَمْرُ عِنْدَنَا أَنَّ كُلَّ مَنْ مَنَعَ فَرِيضَةً مِنْ فَرَائِضِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ فَلَمْ يَسْتَطِعْ الْمُسْلِمُونَ أَخْذَهَا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِمْ جِهَادُهُ حَتَّى يَأْخُذُوهَا مِنْهُ''(موطاامام مالك، ج2ص297)

''ہمارے نزدیک یہ ایک ثابت شدہ شرعی حکم ہے جو شخص بھی اللہ عزوجل کے فرض کردہ امور میں سے کسی فرض کی ادائیگی روک دے اور (وہ ہو بھی اتنا صاحبِ قوت وشوکت کہ) مسلمان اسے اس فرض کی بجاآوری کا پابند نہ کر پائیں، تو اس سے جہاد کرنا ان سب پر واجب ہو گا (نہ یہ کہ اس کی اطاعت ''تسلیم'' کر لی جائے) یہاں تک کہ اس سے زبردستی وہ شرعی حق وصول کر لیا جائے''۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فَقَدْ اتَّفَقَتْ الْأُمَّةُ عَلَى أَنْ مَنْ يَفْعَلُ الْمَعْصِيَةَ يُحَارَبُ ،كَمَا لَوْ اتَّفَقَ أَهْلُ بَلَدٍ عَلَى الْعَمَلِ بِالرِّبَا، وَعَلَى تَرْكِ الْجُمُعَةِ وَالْجَمَاعَةِ''(احكام القرآن لابن العربي ج3ص157)

''پوری امت اس بات پر متفق ہے کہ جو (طائفہ ممتنعہ) بھی معصیت پر اصرار کرے، اس کے خلاف جنگ کی جائے گی (تو پھر کفر پر کیا معاملہ ہو گا) مثلاً اگر کسی علاقے والے سودی لین دین کرنے یا نمازِ جمعہ اور باجماعت نماز ترک کرنے پر متفق ہو جائیں (تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی)''۔

علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وأجمع العلماء على من نصب الحرب فی منع فريضة أومنع حقاً يجب عليه لآدمي وجب قتاله فان أتى القتل على نفسه فدمه هدر''۔(عمدة القاری:34/410)

''اس بات پر علمائے کرام کا اجماع ہے کہ جو شخص کسی فریضے کی ادائیگی یا کسی شخص کے حق کی ادائیگی سے انکاری ہو اور اس پر اَڑے رہنے کی خاطر جنگ کے لئے بھی تیار ہو، تو اس کے خلاف قتال کرنا واجب ہے۔ پھر اگر وہ اس لڑائی میں مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں ہو گا''۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وكل طائفة ممتنعة عن شريعة من شرائع الاسلام الظاهرة المعلومة يجب قتالها ولوتشهدوا۔مثل أن لايصلوا،أولا يزكوا،أولايصوموا،أولا يحجوا البيت،أوقالو نفعل هذا ولاندع الخمر،ولاالزنا،أو الربا،أالفواحش،أولا

نجاهد،أولا نضرب الجزية على أهل الذمة،أونحوذلك،قوتلوا حتى يكون الدين كله لله'' (مختصر الفتاوىٰ المصرية 1/167)

''قوت و شوکت کے حامل ہر وہ گروہ (یعنی طائفہ ممتنعہ)جو اسلام کے مشہور و معلوم احکامات میں سے کسی ایک بھی حکم کی بجاآوری سے انکار کرے ،اس سے لڑنا واجب ہے ،اگرچہ وہ گروہ کلمہ گو(مسلمانوں)پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو۔مثلاً اگر کوئی گروہ نماز پڑھنے یا زکوٰۃ ادا کرنے یا روزے رکھنے یا بیت اللہ کا حج کرنے سے انکار کردے۔یا مثلاً وہ یہ کہے کہ ہم یہ سب فرائض تو ادا کریں گے لیکن شراب نوشی اور زنا نہیں چھوڑیں گے یا سود ترک نہیں کریں گے یا فواحش سے باز نہیں آئیں گے یا ہم جہاد نہیں کریں گے یا ہم ذمیوں پر جزیہ عائد نہیں کریں گے وغیرہ۔تو ایسے گروہ کے خلاف قتال کیا جائے گا، یہاں تک کہ پورے کا پورا دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے''۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''كُلُّ طَائِفَةٍ خَرَجَتْ عَنْ شَرِيعَةٍ مِنْ شَرَائِعِ الْإِسْلَامِ الظَّاهِرَةِ الْمُتَوَاتِرَةِ فَإِنَّهُ يَجِبُ قِتَالُهَا بِاتِّفَاقِ أَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ؛وَإِنْ تَكَلَّمَتْ بِالشَّهَادَتَيْنِ۔فَإِذَا أَقَرُّوا بِالشَّهَادَتَيْنِ وَامْتَنَعُوا عَنْ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَجَبَ قِتَالُهُمْ حَتَّى يُصَلُّوا.وَإِنْ امْتَنَعُوا عَنْ الزَّكَاةِ وَجَبَ قِتَالُهُمْ حَتَّى يُؤَدُّوا الزَّكَاةَ .وَكَذَلِكَ إنْ امْتَنَعُوا عَنْ صِيَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ أَوْ حَجِّ الْبَيْتِ الْعَتِيقِ.وَكَذَلِكَ إنْ امْتَنَعُوا عَنْ تَحْرِيمِ الْفَوَاحِشِ أَوْ الزِّنَا أَوْ الْمَيْسِرِ أَوْ الْخَمْرِ أَوْ غَيْرِ ذَلِكَ مِنْ مُحَرَّمَاتِ الشَّرِيعَةِ ۔وَكَذَلِكَ إنْ امْتَنَعُوا عَنْ الْحُكْمِ فِي الدِّمَاءِ وَالْأَمْوَالِ وَالأَعْرَاضِ وَالْأَبْضَاعِ وَنَحْوِهَا بِحُكْمِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ.وَكَذَلِكَ إنْ امْتَنَعُوا عَنْ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنْ الْمُنْكَرِ وَجِهَادِ الْكُفَّارِ إلَى أَنْ يُسْلِمُوا وَيُؤَدُّوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ''۔(الفتاوىٰ الكبرىٰ لابن تيمية رحمه الله،ج6ص426)

''تمام مسلمان اس امر پر متفق ہیں کہ ہر اُس (ممتنع) گروہ کے خلاف قتال واجب ہے جو اسلا م کے مشہور و متواتر احکام کی بجا آوری ترک کر دے ، اگرچہ وہ شہادتین کا اقرار کرتا ہو۔ مثلاً اگر وہ شہادتین کا اقرار کرنے کے بعد پانچ نمازیں پڑھنے سے انکار کر دیں تو ان کے خلاف قتال واجب ہو گا یہاں تک کہ وہ نماز پڑھنے لگیں۔ اسی طرح اگر وہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کریں تب بھی ان سے لڑنا واجب ہو گا یہاں تک کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ ایسے ہی اگر وہ رمضان کے رکھنے یا حج بیت اللہ کرنے سے انکار کریں تو بھی ان کے خلاف قتال واجب ہو گا۔ پھر اسی طرح اگر وہ فواحش یا زنا یا جوئے یا شراب کی حرمت کا پابند رہنے سے انکار کریں تو بھی ان کا یہی حکم ہو گا۔ نیز اگر وہ اپنے جان و مال ، عزت و آبرو اور شادی بیاہ جیسے معاملات میں کتاب و سنت کے مطابق فیصلے کرنے سے انکار کر دیں ، یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ بجالانے سے انکاری ہو ، یا کفار کے مسلمان ہونے یا ذلیل بن کر جزیہ دینے تک جہاد جاری رکھنے سے انکار کریں ، تب بھی ان کے خلاف قتال کرنا واجب ہو گا''۔

مزید فرماتے ہیں:

''فأيما طائفة امتنعت عن بعض الصلوات المفروضات،أو الصيام ،أو الحج، وعن التزام تحريم الدماء، والاموال، والخمر، والزنا، والميسر أو عن نكاح ذوت المحارم ،وعن التزام جهاد الكفاروضرب الجزية على أهل الكتاب، وغيرذلك من واجبات الدين ومحرماته،التى لاعذر لأحد فى جهودها وتركها،التى يكفر الجاحد لوجوبها؛فان الطائفة الممتنعة تقاتل وان كانت مقرة بها ، وهذا ممالا أعلم فيه خلافاً بين العلماء''۔(الأسئلة والأجوبة الفقهية المقرونة،الجزء الثالث)

''پس جو طائفہ ٔ ممتنعہ بھی بعض فرض نمازوں یا روزے یا حج کی ادائیگی سے انکار کرے؛ یا (اسی طرح کسی کی) جان و مال (پر ناحق تجاوز کرنے) کی حرمت اور شراب، زنا، جوئے اور

محرم رشتہ داروں سے نکاح کی حرمت کا پابند رہنے سے انکار کرے؛ یا کفار کے خلاف جہاد کے التزام یا اہل کتاب پر جزیہ عائد کرنے سے انکار کرے؛ یا ان دیگر فرائض پر عمل یا محرمات سے اجتناب کرنے سے انکاری ہو جائے جنہیں نہ تو ترک کرنے کی شرعاً گنجائش ہے ،نہ ان کی فرضیت یا حرمت کے انکار کی کوئی گنجائش ہے، بلکہ جن کی فرضیت یا حرمت کا انکار کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ تو ہر ایسے طائفہ ممتنعہ کے خلاف قتال کیا جائے گا، خواہ وہ (فرائض کی) فرضیت یا (حرام کی) حرمت کا اعتراف ہی کیوں نہ کرتا ہو (اور محض ان کی ادائیگی سے انکار کر رہا ہو)۔ میرے علم میں نہیں کہ علماء میں سے کوئی بھی اس مسئلے سے اختلاف کرتا ہے"۔

''فَإِنَّ اللَّهَ يَقُولُ فِي الْقُرْآنِ :﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ وَالدِّينُ هُوَ الطَّاعَةُ فَإِذَا كَانَ بَعْضُ الدِّينِ لِلَّهِ وَبَعْضُهُ لِغَيْرِ اللَّهِ وَجَبَ الْقِتَالُ حَتَّى يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ؛ وَلِهَذَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ وَهَذِهِ الْآيَةُ نَزَلَتْ فِي أَهْلِ الطَّائِفِ لَمَّا دَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ وَالْتَزَمُوا الصَّلَاةَ وَالصِّيَامَ ؛لَكِنْ امْتَنَعُوا مِنْ تَرْكِ الرِّبَا ـ فَبَيَّنَ اللَّهُ أَنَّهُمْ مُحَارِبُونَ لَهُ وَلِرَسُولِهِ اذا لَمْ يَنْتَهُوا عَنْ الرِّبَا. وَالرِّبَا هُوَ آخِرُ مَا حَرَّمَهُ اللَّهُ وَهُوَ مَالٌ يُؤْخَذُ بِرِضَا صَاحِبِهِ . فَإِذَا كَانَ هَؤُلَاءِ مُحَارِبِينَ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ يَجِبُ جِهَادُهُمْ فَكَيْفَ بِمَنْ يَتْرُكُ كَثِيرًا مِنْ شَرَائِعِ الْإِسْلَامِ أَوْ أَكْثَرَهَا كَالتَّتَارِ'' (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة رحمه الله ،ج:6ص:427)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:''اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔''بس دین (کلی) اطاعت کا نام ہے اور جب دین (نظام) کچھ اللہ کے لئے ہو اور کچھ غیر اللہ کے لئے تو قتال فرض ہو جاتا ہے

یہاں تک کہ دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ پس اگر تم باز نہ آئے تو تمہارے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا اعلان جنگ ہے۔‘‘ یہ آیات نازل ہوئی تھی اہل طائف کے بارے میں جبکہ وہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور نماز و روزہ کا بھی التزام کر رہے تھے لیکن انہوں نے سود کو ترک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ جب تک وہ سود نہیں چھوڑتے وہ اس وقت تک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ کی حالت میں ہیں۔ سود وہ آخری چیز ہے جس کو اللہ نے قرآن میں حرام ٹھہرایا اور یہ وہ مال ہے جو برضا و رغبت صاحب مال سے لیتا ہے۔ پس جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے والے سود کے عدم تارکین کے خلاف جہاد واجب ہے تو تاتاریوں کی طرح اکثر شعائر اسلام کو ترک کرنے والوں کا معاملہ کیا ہو گا‘‘۔

اگر کوئی طائفہ ممتنعہ کسی متواتر سنت کا بھی انکاری ہو تو اس کے خلاف بھی قتال کیا جائے گا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں:

’’فثبت بالكتاب والسنة واجماع الامة، انه يقاتل من خرج عن شريعة الاسلام، وان تكلم بالشهادتين ۔ وقد اختلف الفقهاء فى الطائفة الممتنعة، لو تركت السنة الراتبة، كركعتى الفجر، هل يجوز قتالها؛ على قولين۔ فاما الواجبات والحرمات الظاهرة والمستفيضة، فيقاتل عليها بالاتفاق‘‘ (السياسة الشرعية، ص:122)

’’پس کتاب اور اجماع امت سے ثابت ہو گیا کہ اس جماعت سے قتال و جنگ کی جائے جو شریعت اسلام سے خارج ہو اگرچہ وہ شہادتین (کلمہ) کا زبان سے اقرار کریں۔ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کوئی طائفہ ممتنعہ سنت کی مزاحمت کرے اور اسے ترک کرنے پر کمر بستہ ہو مثلاً

فجر کی دو سنتوں کا انکار کرے تو دونوں اقوال کے مطابق ان سے جنگ کی جائے، اور اگر واجبات اور ثابت شدہ محرمات ظاہرہ ومشہورہ سے انکار کرے تو بالاتفاق ان سے جنگ کی جائے''۔

''وأيما طائفة انتسبت الى الاسلام، وامتنعت من بعض شرائعه الظاهرة المتواترة، فانه يجب جهادها باتفاق المسلمين، حتى يكون الدين كله لله، كماقاتل أبوبكر الصديق رضى الله عنه وسائر الصحابة رضى الله عنهم مانعي الزكاة، وكان قد توفق فى قتالهم بعض الصحابة، ثم اتفقوا'' (السياسة الشرعية، ص:120)

''وہ گروہ جس کی نسبت اسلام کی طرف ہوتی ہو اور وہ مسلمان کہلاتا ہو، لیکن بعض شرعی قوانین سے وہ احتراز کرے یا منع کرے اور وہ شرعی قوانین ایسے ہوں جو ظاہر اور متواتر ہوں تو ان سے جہاد کرنا واجب ہے، اس پر تمام مسلمان متفق ہیں کہ ایسے لوگوں کے خلاف جہاد وقتال کرنا فرض ہے یہاں تک کہ دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے جیسا کہ امیر المؤمنین سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا۔ گو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے ابتداء میں اس سے اختلاف کیا لیکن بعد میں سب متفق ہو گئے''۔

عصر حاضر کے طواغیت بطور عدوّ صائل:

بلاد اسلامیہ پر مسلط عصر حاضر کے طواغیت اور ان کا وضع کردہ نظام حکومت ''طائفہ ممتنعہ'' کی صورت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اب ''ضروریاتِ خمسہ'' کے لئے ''عدوّ صائل'' بھی بن چکا ہے کیونکہ یہ سب شرعی احکامات سے انکار پر مصر اور شریعت کے نفاذ سے انکاری ہیں بلکہ عامۃ المسلمین کو بھی شریعت پر عمل سے روکتے ہیں، شرق وغرب کے شیطانی قوانین ان پر جبراً مسلط کرتے ہیں۔

غرضیکہ یہ طواغیت مسلمانوں کے دین پر بھی حملہ آور ہو چکے ہیں اور انہیں شریعت پر عمل سے روکنے اور ان گنت فرائض وواجبات کے ترک پر مجبور کرنے کے لئے اپنی تمام قوت وشوکت اور میسر وسائل استعمال کر رہے ہیں۔ پھر صرف یہی نہیں ،بلکہ ان دشمنان دین کی دسترس سے مسلمانوں ،بالخصوص دین دار مسلمانوں کے جان،مال اور عزت غرض یہ کہ کچھ بھی محفوظ نہیں۔

یہ تو رہزنوں (قطاع الطریق) سے بھی بڑے مفسد ہیں، کیونکہ وہ تو محض چند مخصوص راستوں پر بیٹھ کر کسی محدود تعداد میں گزرنے والے لوگوں پر رستہ تنگ کرتے ہیں اور ان کے جان ومال خطرے میں ڈالتے ہیں......... لیکن یہ بد بخت تو پوری ریاستی قوت کے ساتھ کروڑوں مسلمانوں کے دین ،ایمان اور عقیدے پر ہر پہلو سے وار کرتے ہیں۔ پھر جو مسلمان بھی دین پر عمل کرنے کے لئے جتنا آگے بڑھتا ہے ان طواغیت کی فوج، پولیس اور خفیہ اداروں کے ہاتھوں اس کی جان،مال اور عزت پامال ہونے کا خطرہ اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ یہ طواغیت دین کی تمام اقدار مٹانا چاہتے ہیں ،عقائد ہو یا فقہی احکامات ،سیاسیات ہو یا اقتصادی معاملات، معاشرت ہو یا عمومی اخلاقیات، تمام شعبہ ہائے زندگی سے اسلام کو بے دخل کرنا ان کا سوچا سمجھا ہدف ہے۔ لہٰذا زمین پر اس سے بڑھ کر فساد کی کوئی اور صورت نہیں پائی جاسکتی۔

یہ شیاطین صفت طواغیت ہر اعتبار سے مسلمانوں کے دین و دنیا پر حملہ آور (عدو صائل) ہیں۔ پس ''عدوّ صائل'' کے خلاف دفاع ایک ثابت و محکم شرعی حکم ہے۔ لہٰذا شرعاً ان پر ''طائفہ ممتنعہ'' کے ساتھ ساتھ ''عدوّ صائل'' کا حکم بھی چسپاں ہوگا۔ اور اسی لئے ان کے خلاف ''دفاعی قتال'' بغیر کسی شرط کے فرض عین ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَأَمَّا قِتَالُ الدَّفْعِ فَهُوَ أَشَدُّ أَنْوَاعِ دَفْعِ الصَّائِلِ عَنْ الْحُرْمَةِ وَالدِّينِ فَوَاجِبٌ اجْمَاعًا فَالْعَدُوُّ الصَّائِلُ الَّذِى يُفْسِدُ الدِّينَ وَالدُّنْيَا لَا شَيْئَ أَوْجَبَ بَعْدَ الْاِيمَانِ مِنْ دَفْعِهِ فَلَا يُشْتَرَطُ لَهُ شَرْطٌ بَلْ يُدْفَعُ بِحَسَبِ الْاِمْكَانِ. وَقَدْ نَصَّ عَلَى ذَلِكَ الْعُلَمَاءُ أَصْحَابُنَا وَغَيْرُهُمْ''۔ (الفتاویٰ الکبریٰ لابن تیمیة، ج8 ص399)

''اور جہاں تک دفاعی قتال کی بات ہے تو دین اور حرمتوں پر حملہ آور دشمن کے خلاف اپنے دفاع کی سب سے موثر صورت یہی ہے اور اسی لئے یہ بالاجماع واجب ہے۔ایمان لانے کے بعد اس سے بڑا فرض کوئی نہیں کہ دین و دنیا کو برباد کرنے کے درپے حملہ آور دشمن کو بچھاڑ اجائے۔اس قتال (کی فرضیت) کے لئے کوئی شرط نہیں، بلکہ ہر ایک (پر لازم ہے کہ وہ) حسب استطاعت دشمن کو پچھاڑنے میں اپنا حصہ ڈالے۔ہمارے اصحاب اور دیگر علمائے کرام نے یہ مسئلہ بالکل صراحت کے ساتھ بیان کیاہے''۔

امام ابو بکر الجصاص الحنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَكَذٰلِكَ حُكْمُ مَنْ يَأْخُذُ أَمْوَالَ النَّاسِ مِنَ الْمُتَسَلِّطِينَ الظَّلَمَة وَآخِذِي الضَّرَائِبِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ الْمُسْلِمِينَ قِتَالُهُمْ وَقَتْلُهُمْ اذَا كَانُوا مُمْتَنِعِينَ ، وَهَؤُلَاءِ أَعْظَمُ جُرْمًا مِنْ آكِلِي الرِّبَا لِانْتِهَاكِهِمْ حُرْمَةَ النَّهْيِ وَحُرْمَةَ الْمُسْلِمِينَ جمِيعًا. وَآكِلُ الرِّبَا انَّمَا انْتَهَكَ حُرْمَة اللّٰهِ تَعَالَى فِي أَخْذِ الرِّبَا وَلَمْ يَنْتَهِكْ لِمَنْ يُعْطِيهِ ذَلِكَ حُرْمَة؛لِأَنَّهُ أَعْطَاهُ بِطِيبَةِ نَفْسِهِ. وَآخِذُو الضَّرَائِبِ فِي مَعْنَى قُطَّاعِ الطَّرِيقِ الْمُنْتَهِكِينَ لِحُرْمَةِ نَهْيِ اللّٰهِ تَعَالَى وَحُرْمَةِ الْمُسْلِمِينَ ؛ اذْ كَانُوا يَأْخُذُونَهُ جَبْرًا وَقَهْرًا لَا عَلَى تَأْوِيلٍ وَلَا شُبْهَةٍ ، فَجَائِزٌ لِمَنْ عَلِمَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ اصْرَارَ هَؤُلَاءِ عَلَى مَا هُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَخْذِ أَمْوَالِ النَّاسِ عَلَى وَجْهِ الضَّرِيبَةِ أَنْ يَقْتُلَهُمْ كَيْفَ أَمْكَنَهُ قَتْلُهُمْ، وَكَذٰلِكَ أَتْبَاعُهُمْ وَأَعْوَانُهُمُ الَّذِينَ بِهِمْ يَقُومُونَ عَلَى أَخْذِ الْأَمْوَالِ .''(احکام القرآن للجصاص،ج3،ص:191)

''اسی طرح ان ظالموں کا حکم بھی یہی ہے جو لوگوں پر (بطور حاکم) مسلط ہو کر ان کے مال ناحق چھینتے ہیں اور ان سے ناجائز محصولات (ٹیکس) بٹورتے ہیں۔اگر یہ لوگ طائفہ ممتنعہ (طاقتور گروہ) کی صورت میں ہوں تو ان کے خلاف قتال کرنا اور انہیں قتل کرنا تمام

مسلمانوں پر واجب ہو گا۔ یہ لوگ تو سود خوروں سے بھی بڑے مجرم ہیں، کیونکہ یہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکامات کی حرمت پامال کرتے ہیں، بلکہ مسلمانوں کی حرمت کا بھی پاس نہیں کرتے۔ اس کے برعکس سود خور حکم الٰہی کی حرمت تو یقیناً پامال کرتا ہے، لیکن سود دینے والے کی حرمت پامال نہیں کرتا، کیونکہ وہ تو اپنی رضا سے سود دیتا ہے۔ ناحق محصولات لینے والے ان ظالموں کا حکم تو اُن رہزنوں (قطاع الطریق) کا سا ہے جو اللہ کی حدود کو بھی روندتے ہیں اور مسلمانو (کے اموال) کی حرمت بھی پامال کرتے ہیں۔ یہ بھی رہزنوں کی طرح کسی تاویل یا شبہے کے بغیر جبراً و قہراً (مسلمانوں کا) مال غصب کرتے ہیں۔ پس جو مسلمان بھی ایسے لوگوں کو جانتا ہو جو محصولات کے نام پر مسلمانوں کا مال ناحق لوٹتے ہوں اور اس پر مصر بھی رہیں، اس کے لئے جائز ہے کہ (ٹیکس دینے کے) کسی بھی ممکنہ طریقے سے ان ظالموں کو قتل کر ڈالے۔ اسی طرح ہر مسلمان کے لئے ان کے پیروکاروں و مدد گاروں کو قتل کرنا بھی جائز ہو گا کہ جن کے بل پر یہ عام لوگوں سے ناحق مال چھیننے کی قابل ہوتے ہیں"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فَعُلِمَ أَنَّ مُجَرَّدَ الِاعْتِصَامِ بِالْإِسْلَامِ مَعَ عَدَمِ الْتِزَامِ شَرَائِعِهِ لَيْسَ بِمُسْقِطٍ لِلْقِتَالِ. فَالْقِتَالُ وَاجِبٌ حَتَّى يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ وَحَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ. فَمَتَى كَانَ الدِّينُ لِغَيْرِ اللَّهِ فَالْقِتَالُ وَاجِبٌ۔'' (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة، ج6ص425)

"تو معلوم ہوا کہ جب تک اسلام کے احکامات کی عملاً پابندی نہ ہو جائے، اس وقت تک اسلام کو خالی اپنا لینے سے قتال ساقط نہیں ہو جاتا، اس لئے جب تک دین کل کا کل ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کے لئے نہ ہو جائے اور جب تک فتنہ ختم نہ ہو جائے قتال "واجب" ہے

۔ چنانچہ جب (اطاعت و پابندی حکم و قانون) غیر اللہ کے لیے ہو جائے تو قتال واجب ہو جاتا ہے"۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "فتح الباری" میں اور امام ابن حبان رحمہا اللہ نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں،، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (صلحِ حدیبیہ کے ایک سال بعد) عمرۂ قضا کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے یہ "رجزیہ" اشعار پڑھتے جا رہے تھے:

خلوا بنی الکفار عن سبیله

قد انزل الرحمٰن فی تنزیله

بان خیر القتل فی سبیله

نحن قتلنا لکم علی تاویله

کما قتلناکم علی تنزیله

(رواه الطبرانی ورجاله رجال الصحیح ،مجمع الزوائد،ج:6،ص:147۔فتح الباری لابن حجر رحمہ اللّٰہ ،ج:12ص:65)

ترجمہ: اے کافروں کی اولاد! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ چھوڑ دو، بے شک مہربان اللہ نے اپنے کلام میں فرمایا ہے کہ:" بہترین قتل وہ ہے جو اس کی راہ میں ہو"۔ (لہٰذا) ہم تم کو قتل کریں گے اس قرآن کی مراد (یعنی معانی واحکامات) منوانے پر بھی، جیسا کہ ہم نے تم کو قتل کیا ہے اس کے نزول کے منوانے پر۔

امام العصر حضرت انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اس روایت کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" یہ روایت "نصِ صحیح" ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کے وہ معانی و مصادیق جن پر صحابہؓ اور سلف صالحین رحمہم اللہ کا اجماع ہو چکا ہے، ان کو منوانے اور

تسلیم کرانے پر بھی اسی طرح جنگ کی جائے گی جیسے قرآن کو کلام اللہ اور منزل من اللہ منوانے کے لئے جنگ کی گئی ہے۔" (اکفار الملحدین، ص172)

عصر حاضر میں اقامت دین کا واحد طریقہ
”جہاد فی سبیل اللہ“

جیسا کہ ہم سمجھ چکے ہیں کہ سقوطِ خلافت کے بعد دورِ حاضر کے عظیم فتنوں میں سے سب سے بڑا فتنہ ایسے طواغیت کا بلادِ اسلامیہ پر مسلط ہو جانا ہے جو کہ ایک طرف اللہ کی نازل کردہ شریعت کو چھوڑ کر اپنی خواہشاتِ نفس یا اغیار کے وضع کردہ قوانین کو نافذ کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہود و ہنود اور نصاریٰ کی جانب سے برپا کردہ صلیبی جنگ میں ان کو لاجسٹک سپورٹ فراہم کرنے، اپنی فضاء اور بحر و بر ان کے حوالے کر دینے کے علاوہ، تمسک فی الدین کی وجہ سے مسلمانوں کے قتل عام کرنے اور مسلمان مرد و خواتین کو چند ڈالروں کے عوض یہود و نصاریٰ کے ہاتھوں بیچ دینے جیسے کافر و مرتد بنا دینے والے افعال سے بھی گریزاں نہیں ہیں۔

چنانچہ ایسی صورتحال میں بلا کسی شک و تردد کے یہ بات واضح ہو چکی کہ آج امت مسلمہ پر اقامت دین، شریعت کے نفاذ یا بالفاظ دیگر خلافت کے قیام کے لئے شریعت کا مقرر کردہ حکم ”قتال فی سبیل اللہ“ ہر مسلمان مرد و زن پر ”فرض عین“ ہو چکا ہے، جس سے انکار کسی صورت ممکن نہیں۔

چنانچہ اقامت دین کے لئے کھڑی ہونے والی جو جماعت بھی شریعت اسلامی کے مقرر کردہ طریقہ واضح ہونے کے بعد بھی اس کو چھوڑ کر کسی اور طریقے کو اختیار کرتی ہے جو کہ شریعت کے مقرر کردہ اصولوں کے بالکل بر خلاف ہو تو اس جماعت کا یہ عمل دراصل اس بات کی علامت کہ وہ شریعت کے مقرر کردہ طریقہ کار کو دوسرے طریقے کار کے مقابلے میں ناقص اور ناقابل عمل سمجھتی ہے یا پھر ان شرعی احکامات سے انحراف کے راستے پر گامزن ہے جس سے اظہار لاتعلقی اور برأت ہر مسلمان اور خاص کر اس جماعت کے متعلقین و احباب پر لازم ہے۔

غرضیکہ قرآن و سنت اور سلف وخلف کے طرزِ عمل سے یہ بات صراحت کے ساتھ واضح ہو چکی کہ تاقیامِ قیامت "جہاد فی سبیل اللہ" ہی وہ واحد طریقہ ہے جو اپنے شرعی واصطلاحی معانی:

((وَمَا الْجِهَادُ قَالَ أَنْ تُقَاتِلَ الْكُفَّارَ إِذَا لَقِيتَهُمْ قَالَ فَأَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُهُ وَأُهْرِيقَ دَمُهُ))(مسند احمد،ج:24،ص:397،رقم الحدیث:16413۔ کنز العمال ج:1،ص:27 ورجاله ثقات)

"پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جہاد کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاد یہ ہے کہ تم مقابلے کے وقت کفار سے لڑو، کہا گیا افضل ترین جہاد کون سا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کا جہاد جس کا گھوڑا کٹ مرے اور خود اس کا بھی خون گر جائے (یعنی وہ شہید ہو جائے)"۔

''وَشَرْعًا بَذْلُ الْجُهْدِ فِي قِتَالِ الْكُفَّارِ'' (الفتح الباری ج8ص365)

"اور اصطلاحِ شریعت میں کفار سے قتال کرنے میں اپنی پوری طاقت کو استعمال کرنے کا نام جہاد ہے"۔

''بذل الواسع والطاقة بالقتال فی سبیل اللہ عزوجل بانفس والمال وغیر ذلك'' (امام کاسانی رحمه الله، بداع ج:9ص:4299)

"اللہ کے راستے میں قتال کے لئے نفس، مال اور زبان وغیرہ کی پوری طاقت لگا دینا"۔

کے ساتھ کہ خلافت کے قیام، شریعت کا نفاذ، فتنوں کو رفع کرنے اور غلبۂ دینِ حق کے لئے کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی اقامت و حفاظت کا قیامت تک سب سے بڑا ذریعہ "جہاد فی سبیل اللہ" ہی کو قرار دیا ہے:

((عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لَنْ يَبْرَحَ هَذَا الدِّينُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنْ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ))

(صحیح مسلم ،ج:10،ص:38،رقم الحدیث:3546۔کنزالعمال،ج:12،ص:164،رقم الحدیث:34495)

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دین قائم رہے گا کیونکہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے (قیام کے) لئے قتال کرتی رہے گی قیامت واقع ہونے تک"۔

چنانچہ حکم باری تعالیٰ بھی یہی ہے کہ:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾(سورۃ الانفال:39)

"اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے"۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو ان باتوں کی صحیح سمجھ دے دیتا ہے:

((مَنْ يُرِدْ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَلَا تَزَالُ عِصَابَةٌ مِنْ الْمُسْلِمِينَ يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ عَلَى مَنْ نَاوَأَهُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ))(صحیح مسلم،ج:10،ص:41،رقم الحدیث:3549)

"اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ دیدیتا ہے اور (جو دین کو سمجھ گیا تو اس سے یہ بات مخفی نہیں کہ) قیامت تک مسلمانوں میں سے ایک جماعت حق پر لڑتی رہے گی اور اپنے سے الجھنے والوں پر غالب رہے گی۔"

چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنے ہاتھ میں قرآن اور تلوار کو لے کر یہ اصول واضح کر دیا:

((عن عمرو بن دينار قال رأيت جابر بن عبد الله رضي الله عنه وبيده السيف والمصحف وهو يقول: امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نضرب بهذا من خالف مافي هذا))(كنز العمال، ج:1،ص:384،رقم الحديث:1664)

''عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو دیکھا اس حال میں کہ ان کے ہاتھ میں ''تلوار'' اور قرآن تھا اور انہوں نے کہا: ''ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم اس تلوار سے اُس کو ماریں جو اس قرآن کے خلاف چلے''۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''دین حق کے لئے آسمانی کتاب کا ہونا ضروری ہے جو ہدایت کا روشن مینار ہو اور اس کتاب کی مدد کے لئے ''تلوار'' مددگار ہو،اس کتاب اللہ میں اوامر و نواہی یعنی کرنے اور نہ کرنے کے احکامات ہوں گے اور ''تلوار'' برابر اس کی مدد اور تائید کرتی رہے گی''(منہاج السنہ ،ج:1ص:142)

ایک اور جگہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فمن عدل عن الكتاب قوم بالحديد؛ ولهذا كان قوام الدين بالمصحف والسيف۔ وقد رويعن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما قال:((أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نضرب بهذا))يعني السيف من عدل عن هذا يعني المصحف''(السياسة الشرعيه :باب كيفية معرفة الأصلح في الولاية،ص19)

''پس جو شخص کتاب اللہ کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرے، اُسے لوہے (یعنی تلوار) سے سیدھا کیا جائے، اس لئے کہ دین کا قیام، دین کی مضبوطی اور پائیداری کتاب اللہ اور شمشیر سے ہوتی ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں ہمیں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے: ((اَنْ نَضْرِبَ بِھٰذَا)) "یعنی تلوار سے اُسے ماریں جو قرآن سے منہ موڑے"۔

اب ہمارے لئے یہی راہ عمل رہ گیا کہ:

الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی کے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اور یہ کہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم

انٹرنیٹ ایڈیشن:
مسلم ورلڈ ڈیٹا پروسیسنگ پاکستان
http://www.muwahideen.co.nr